

آشیانه

04-13-2017



آزل

## فہرست

ادب و مزاح

۱. انگش و نگش .....

بچوں کی دنیا

۳. انوکھی سزا .....

۴. آخری گولی .....

۶. شیر اور گیدڑ کا مقدمہ، بندر کا انصاف .....

۷. ہائے میرا بچپن!!!! .....

سچی کہانیاں

۹. حکیم صاحب .....

مشہور شخصیات

۱۱. اردو ادب کا ایک نام۔ ابن انشاء .....

۱۲. اقبال اور فلسفہ خودی .....

معاشرہ اور ثقافت

۱۴. بہتر گھر .....

۱۵. چینی کے بغیر چینی چائے کا لطف .....

۱۶. لاہور ایک قدیم شہر .....

۱۷. مدر ڈے .....

## انگلش و نگلش

مصنف: یوسف

مجھے بچپن سے ہی انگریزی میں فیل ہونے کا شوق تھا لہذا میں نے ہر کلاس میں اپنے شوق کا خاص خیال رکھا۔ ویسے تو مجھے انگریزی کوئی خاص مشکل زبان نہیں لگتی تھی، بس ذرا سپیلنگ، گرامر اور Tenses نہیں آتے تھے۔ مجھے یاد ہے جو ٹیچر ہمیں کلاس میں انگریزی پڑھایا کرتے تھے وہ بھی کاٹھے انگریز ہی تھے، دو سال تک ”سی۔۔۔ پی۔۔۔ سپ“ پڑھاتے رہے، مشین کو ”مچن“ اور نالج کو ”کنالج“ کہتے رہے۔ ایسی تعلیم کے بعد میری انگریزی میں اور بھی نکھار آگیا، مجھے یاد ہے میٹرک کے داخلہ فارم میں جب ایک کالم میں ”Sex“ لکھا ہوا تھا تو میں کافی دیر تک شرما رہے ہوئے سوچتا رہا کہ ایک لائن میں اتنی لمبی تفصیل کیسے لکھوں؟؟؟ فارم کے پہلے کالم میں اپنا نام انگریزی میں لکھنا تھا لیکن انگریزی سے نااہل ہونے کی وجہ سے مجھے یہ نام لکھنے کے لیے اسلام آباد کا سفر کرنا پڑا کیونکہ فارم پر لکھا ہوا تھا ”Fill in capital“۔ انگریزی فلمیں دیکھتے ہوئے بھی مجھے کہانی تو سمجھ آ جاتی تھی، سنو ری پلے نہیں پڑتی تھی۔ سکس ملین ڈالر مین، نانٹ رائڈر، چپن، ایر وولف اور کوجیک جیسی مشہور زمانہ فلمیں میں نے صرف اور صرف اپنی ذہانت سے سمجھیں اور انجوائے کیں۔

آج سے کچھ سال پہلے تک مجھے یقین ہو چکا تھا کہ میں فارسی، عربی، پشتو اور اشاروں کی زبان تو سیکھ سکتا ہوں لیکن انگریزی نہیں، لیکن اب جو حالات چل رہے ہیں ان کو مد نظر رکھ کر میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ یا تو مجھے انگریزی آگئی ہے، یا سب کو بھول گئی ہے۔ کچھ بھی ہو، میری خوشی کی انتہا نہیں، اب سارے سپیلنگ بدل گئے ہیں اور دو تین لفظوں میں سا گئے ہیں۔ اب Coming لکھنا ہو تو صرف cmg سے کام چل جاتا ہے۔ گرل فرینڈ GF ہو گئی ہے اور فیس بک FB بن گئی ہے۔ اب کوئی انگریزی کا لمبا لفظ لکھنا ہو تو اس سے پہلے کے چند الفاظ لکھ کر ہی ساری بات کہی جاسکتی ہے، میں نے ساڑھے تین سال کی ”فیوژن ہاشقت“ کے بعد unfortunately کے سپیلنگ یاد کیے تھے، آج کل صرف Unfort سے کام چل جاتا ہے یعنی جہاں سے مشکل سپیلنگ شروع وہیں پہ ختم۔ بات یہاں تک رہتی تو ٹھیک تھا لیکن اب تو

اس مختصر انگریزی میں بھی ایسی ایسی مشکلات آن پڑی ہیں کہ کئی دفعہ جملہ سمجھنے کے لیے استخارہ کرنا پڑتا ہے۔ ابھی کل مجھے ایک دوست کا میج آیا، لکھا تھا ”U r inv in bk crmy“ میں نے حیرت سے میج کو پڑھا، اللہ جانتا ہے تین چار دفعہ مجھے شک گذرا کہ اس نے مجھے کوئی گندی سی کالی لکھی ہے، دل مطمئن نہ ہوا تو ایسی ہی انگلش لکھنے اور سمجھنے کے ماہر ایک اور دوست سے رابطہ کیا، اس مرد مجاہد نے ایک سینڈ میں ٹرانسلیشن کر دی کہ لکھا ہے ”You are invited in book’s ceremony!!!“

انگریزی سے نمٹنے کا ایک اور اچھا طریقہ میرے ہمسائے شاکر صاحب نے نکالا ہے، جہاں جہاں انہیں انگریزی نہیں آتی وہاں وہ اطمینان سے اردو ڈال لیتے ہیں۔ مثلاً اگر کھانا کھاتے ہوئے انہیں کسی کا میج آجائے تو جواب میں لکھ بھیجتے ہیں ”پلیز اس ٹائم ٹاٹ ڈسٹرب، آئی ایم کھانا کھانینگ۔“ ایک دفعہ موصوف کو فیس بک پر ایک لڑکی پسند آگئی، فوراً لکھا ”آئی وائنٹ ٹو شادی وڈ یو۔۔۔ آریو راضی؟“۔ لڑکی کا جواب آیا ”ہاں آئی ایم راضی، بٹ پہلے ٹرائی نو راضی میرا بیو تے بے بے۔“ آج کل یہ دونوں میاں بیوی ہیں اور اکثر اسی انگریزی میں لڑائی جھگڑا کرتے ہیں، تاہم اب وہ درمیان میں اردو کی بجائے پنجابی بولتے ہیں اور ایک جملہ بار بار دہراتے ہیں ”آئی سیڈ کھصماں نوں کھا، یو سارا خاندان از چول۔“

انگریزی کے بدلنے ہوئے رنگ صرف یہیں تک محدود نہیں، اب تو کوئی صحیح انگلش میں جملہ لکھ جائے تو اس کی ذہنی حالت پر شک ہونے لگتا ہے، ماڈرن ہونے کے لیے انگریزی کا بیڑا فرق کرنا بہت ضروری ہو گیا ہے، میں تو کہتا ہوں انگریزی کی صرف ٹانگ ہی نہیں، دانت بھی توڑ دینے چاہئیں، اس بد بخت نے ساری زندگی ہمیں خون کے آنسو رلایا ہے۔ تازہ ترین اطلاعات کے مطابق اب انگریزی لکھنے کے لیے گرامر اور Tenses بھی غیر ضروری ہو گئے ہیں۔ یعنی اگر کسی کو کہنا ہو کہ ”میں تمہارا منتظر ہوں، تم کب تک آؤ گے؟“ تو بڑی آسانی سے اسے چٹکیوں میں یوں لکھا جاسکتا ہے m wtg u cm whn!!!

دنیا مختصر سے مختصر ہوتی جا رہی ہے، کمپیوٹر ڈیسک ٹاپ سے لیپ ٹاپ اور اب آئی پیڈ میں سا چکے ہیں، موٹے موٹے ٹی وی اب سمارٹ ایل سی ڈی کی شکل میں آگئے ہیں، ونڈو اے سی کی جگہ سپلٹ اے سی نے لے لی ہے، انٹرنیٹ ایک چھوٹی سی USB میں سٹ چکا ہے

ایسے میں انگریزی کو سب کے لیے قابل قبول بنانے کی اشد ضرورت محسوس ہو رہی تھی، اردو کا حل تو ”رومن اردو“ کی شکل میں بہت پہلے نکل آیا تھا، اب انگریزی کی مشکل بھی حل ہو گئی ہے۔ اب جو جتنی غلط انگریزی لکھتا ہے اتنا ہی عالم فاضل خیال کیا جاتا ہے، اگر آپ کو کسی دوست کی طرف سے میج آئے اور اس میں That کی بجائے Dat لکھا ہو تو یہودہ سا قبضہ لگانے کی بجائے ایک لمحے میں سمجھ جائیں کہ آپ کا دوست ایک ذہین اور دنیا دار شخص ہے جو جدید انگریزی کے تمام تر لوازمات سے واقف ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ شاید انگریزی میں اردو اور پنجابی کا تزکا ہمارے ہاں ہی لگایا جاتا ہے لیکن میرا خیال غلط ثابت ہوا، سعودیہ میں مقیم میرا بھانجا بتا رہا تھا کہ یہاں کے عربی بھی انگریزی کا شوق پورا کر رہے ہوں تو جہاں جہاں انگریزی آنکھیں دکھاتی ہے وہاں یہ عربی کا لفظ ڈال لیتے ہیں، مثلاً اگر انگریزی میں کہنا ہو کہ یہ میرا گھر ہے تو بڑے آرام سے کہہ جاتے ہیں ”ہذا مائی ہوم۔“

انگریزی اتنی آسان ہو گئی ہے لیکن بڑے دکھ کے ساتھ بتانا پڑ رہا ہے کہ یہ آسان انگریزی صرف ہماری عام زندگیوں میں ہی قابل قبول ہے، انگریزی کا مضمون پاس کرنے کے لیے تاحال اسی جناتی انگریزی کی ضرورت ہے جو خود انگریزوں کو بھی نہیں آتی۔ پتا نہیں آج کل کی رنگ بدلتی انگریزی میں اب پرانی انگریزی کی کیا ضرورت رہ گئی ہے؟ پہلے کبھی لگتا تھا کہ ساری دنیا میں انگریزی کی اشد ضرورت ہے، دنیا سے رابطے کے لیے انگریزی بولنا اور لکھنا بہت ضروری ہے، لیکن اب تو لگتا ہے عالمی رابطے کے لیے کوئی نئی زبان ہی وجود میں آ رہی ہے، یہ زبان کسی نے نہیں بنائی، نہ اس کے کوئی قواعد ہیں، بس یہ موجود بن گئی ہے اور لگ رہا ہے کہ کچھ عرصے تک باقاعدہ ایک شکل اختیار کر جائے گی، یہ زبان سب سمجھ سکتے ہیں، لکھ سکتے ہیں لیکن شاید بول کبھی نہیں سیکھیں گے کیونکہ یہ

”شارٹ پیئر“ کی وہ قسم ہے جو کسی کالج یا انسٹی ٹیوٹ میں نہیں پڑھائی جاتی۔ اس زبان میں خوبیاں تو بہت ہیں لیکن ایک کی ہمیشہ محسوس ہوتی رہے گی، یہ جذبات سے عاری زبان ہے، یہ چند لفظوں میں دو ٹوک بات کرنے کی عادی ہے، اس زبان میں کسی کی موت پر v sad لکھ دینا ہی کافی سمجھا جاتا ہے، یہ محبتوں اور احساسات سے محروم زبان ہے۔ میں یہ زبان کچھ کچھ سیکھ چکا ہوں، لیکن استعمال کرنے سے گھبراتا ہوں، پتا نہیں کیوں مجھے لگتا ہے اگر میں نے بھی یہ زبان شروع کر دی تو مجھ میں اور روبوٹ میں کوئی فرق نہیں رہ جائے گا۔

---

§§§

---



## انوکھی سزا

مصنف: یوسف

”حسن بیٹا، دوکان سے ایک کلو چینی جلدی سے لے آؤ،“ حسن کی امی نے حسن کو دیکھ کر بلند آواز سے کہا۔ حسن اس وقت کھیل کر گھر میں داخل ہو رہا تھا۔



”جی امی! ابھی جاتا ہوں“ حسن نے جواب دیا، اور گھر سے کچھ ہی دور موجود دوکان کی طرف چل پڑا، دوکان پر پہنچ کر حسن نے ایک کلو چینی کا آرڈر دیا۔

دوکاندار حسن کی بات سن کر مڑا اور دوکان کے اندرونی حصے کی طرف چینی لینے کے لئے چلا گیا، اسی دوران حسن کی نگاہ دوکان میں سامنے ریٹنگ پر رکھے ایک ڈبہ پر پڑی جو رنگ برنگے کیکوں سے بھرا پڑا تھا، حسن اس وقت بھوکا تھا، اسکے دل میں نہ جانے کیا خیال آیا اس نے دوکاندار کو اپنی طرف متوجہ نہ پا کر جلدی سے ایک کیک اٹھایا اور منہ میں ڈال کر نگٹے کی کوشش کرنے لگا، اسی دوران دوکاندار واپس آگیا، اور حسن کو چینی دی، حسن نے چینی لے کر رقم ادا کی، اور گھر کی طرف چل پڑا۔

حسن دل ہی دل میں بہت خوش تھا کہ دوکاندار اسکی چوری کو نہیں دیکھ سکا، اور کیک مفت میں اس نے کھا لیا، کیک کا ذائقہ حسن کو بہت اچھا لگا، لیکن اسے محسوس ہو رہا تھا کہ جب سے اس نے کیک کھایا ہے اسکے گلے میں کوئی چیز پھنس سی گئی ہے۔

حسن گھر پہنچا، ماں کو چینی تھائی اور ایک کمرے میں موجود آئینے کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا، حسن نے اپنا منہ کھولا اور آئینے کی مدد سے گلے میں جھانکنے لگا، کہ وہ کون سی چیز ہے جو اس کے گلے میں پھنس گئی ہے، اور اب تو درد بھی ہونے لگا تھا۔ حسن زور لگا کر پورا منہ کھولنے کی ناکام کوشش کرتا رہا، مگر اسے کوئی چیز نظر نہیں آئی۔

ابھی حسن آئینے کے سامنے کھڑے منہ کھولے دیکھ ہی رہا تھا کہ اچانک حسن کی امی کمرے میں داخل ہوئیں اور حسن کو یوں منہ کھولے آئینے کے سامنے کھڑا دیکھ کر حیران ہوئیں، اور پوچھا، حسن بیٹا اس طرح منہ کھولے آئینے کے سامنے کھڑے کیا دیکھ رہے ہو۔

حسن اپنی امی کو سامنے دیکھ کر گھبرا گیا، اور بولا، نہیں امی، بس ویسے ہی کھڑا ہوں۔

ابھی حسن نے بس اتنا ہی کہا تھا کہ اس کے گلے میں ایسا شدید درد ہوا جیسے اسکے گلے کو کسی نے تیز دھار آلے سے کاٹ دیا ہو، حسن وہیں زمین پر لوٹ پوٹ ہو گیا۔

حسن کی امی یہ دیکھ کر گھبرا گئیں کہ اچانک میرے بیٹے کو کیا ہو گیا ہے؟ حسن کی امی نے جلدی سے حسن کو سیدھا کر کے بستر پر لٹایا اور پوچھا کہ کیا ہوا ہے بیٹا؟

حسن مسلسل چیخے، چلائے جا رہا تھا، اس کے گلے سے عجیب و غریب آوازیں نکل رہی تھیں، اسکے منہ سے ہلکا سا خون بھی باہر نکل رہا تھا اب حسن کو یقین ہو گیا تھا کہ اسکے گلے میں کوئی چیز موجود ہے جسکی وجہ سے اسکی یہ حالت ہو گئی ہے۔ حسن کی امی یہ سب دیکھ کر شپٹا گئیں اور زور زور سے سب گھر والوں کو آوازیں دینے لگیں، حسن کے ابو، دادا، دادی، بہن، بھائی سب دوڑے چلے آئے، اور حسن کی حالت دیکھ کر سب گھبرا گئے۔

حسن کے دادا نے جلدی سے پانی منگوا یا اور حسن کو بہت سا پانی پلایا لیکن کچھ افادہ نہ ہوا۔ حسن کا درد اور ٹھیں ویسی ہی رہیں، اس کی حالت غیر ہو رہی تھی، وہ دل ہی دل میں اس وقت کو کوس رہا تھا، جب اس نے چوری چھپے وہ کیک کھایا تھا۔

حسن کی دادی اماں نے ایک روٹی کا ٹکڑا منگوا یا اور حسن کے منہ میں ڈال دیا، حسن نے اس روٹی کے ٹکڑے کو باہر اگل دیا، اس سے کچھ نہیں کھایا جا رہا تھا۔

تب حسن کے ابو نے سختی سے پوچھا کہ حسن سچ بتاؤ کیا کھایا تھا جس کی وجہ سے یہ حالت ہو رہی ہے، حسن نے جب یہ دیکھا کہ اب بتانے کے سوا کوئی چارہ نہیں، تو اس نے روتے ہوئے شرمندہ لہجے میں سب کو بتادیا کہ اس نے دوکاندار کی نظروں سے بچ کر ایک کیک کھایا تھا تب سے اس کے گلے میں کوئی چیز پھنس گئی ہے۔

حسن کے ابو نے ایک خشک روٹی کا بڑا سا ٹکڑا منگوا یا اور حسن کو اسکے نگٹے کا حکم دیا، حسن نے بہت انکار کیا، مگر اس کی ایک نہ چلی، مجبوراً اس نے وہ ٹکڑا منہ میں رکھا اور اسے نگٹے کی کوشش کرنے لگا، حسن کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا، وہ برے برے منہ بنا رہا تھا، اور دل میں اپنے آپ پر لعن طعن کر رہا تھا کہ کاش وہ کیک کھانے کی غلطی نہ کرتا۔



حسن مسلسل اس خشک روٹی کے ٹکڑے کو نگٹے کی کوشش کر رہا تھا، کہ اچانک اسے زوردار ایکاٹی آئی اور

مسلسل تے شروع ہو گئیں، جیسے ہی تے رکی، حسن کو گلے میں کچھ سکون محسوس ہوا، اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اب اسکے گلے میں کوئی چیز نہیں ہے، اب اسے درد بہت کم محسوس ہو رہا تھا۔ حسن کے ابو اب اس تے کو دیکھ رہے تھے کہ آخر کیا چیز حسن کے گلے میں پھنس بن کر اسے تکلیف دے رہی تھی۔ اچانک حسن کے ابو کو کسی کالی سی چیز کے ٹکڑے نظر آئے، غور سے دیکھنے پر پتا چلا کہ یہ چیونٹے کا پچھلا حصہ ہے اور یہی چیونٹا حسن کے گلے میں پھنس گیا تھا، اسی کے کاٹنے کی وجہ سے حسن کی حالت غیر ہو گئی تھی، چیونٹے دیکھ کر اب سب کو یہ بات سمجھ آ گئی تھی کہ جب حسن نے جلدی سے کیک اٹھا کر منہ میں ڈالا تھا، تو اس وقت وہ چیونٹا اس کیک پر بیٹھا تھا، وہ بھی کیک کے ساتھ حسن کے منہ میں چلا گیا، لیکن پیٹ میں جانے کی بجائے حلق میں پھنس کر رہ گیا، اور باہر نکلنے کی مسلسل کوشش کرنے کی وجہ سے حسن کو یہ سب کچھ چھیلنا پڑا۔ حسن کو اس کے کیے کی سزا مل چکی تھی۔ وہ سب گھر والوں کے سامنے ندامت کھڑا تھا۔ حسن کے ابو نے حسن کو گلے سے لگا لیا اور معاف کر دیا۔ اور وعدہ لیا کہ آئندہ حسن کبھی ایسی حرکت نہیں کرے گا۔

اگلے دن جب حسن کی حالت کچھ سنبھل گئی تو حسن کی امی نے حسن کو پانچ روپے دیے اور کہا کہ جاؤ بیٹا یہ پیسے دوکاندار کو دے آؤ۔ یہ اس کیک کے پیسے ہیں جو تم نے کھل کھایا تھا، حسن اسی دوکان پر چلا گیا اور دوکاندار سے کہا کہ معذرت انکل، کل آپکی دوکان سے میں نے غلطی سے کیک کھایا تھا اور پھر حسن نے جیب سے پیسے نکالے اور دوکاندار کی طرف بڑھا دیئے۔ دوکاندار حسن کی اس ایمانداری کو دیکھ کر بہت خوش ہوا اور سامنے پڑے ہوئے اسی کل والے کیک کی طرح ایک اور کیک نکال کر حسن کی طرف بڑھا دیا اور کہا کہ یہ کیک لے لو بیٹا، یہ میری طرف سے اس ایمانداری کا انعام سمجھ کر کھا لو، حسن نے جیسے ہی کیک دیکھا اسے کل خود کے ساتھ بیٹا ماجرا یاد آگیا، اسے یوں محسوس ہوا جیسے اسکے گلے میں پھر سے کوئی چیز پھنس گئی ہو حسن فوراً گھر کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ دوکاندار حسن کو یوں بھگاتا دیکھ کر حیران ہوا اور سوچنے لگا کہ کتنا پیارا اور نیک بچہ ہے، ایسا بچہ آجکل کہاں دیکھنے کو ملتا ہے۔ اب اسے کیا معلوم کہ حسن کے ساتھ یہ کیک کھانے کی وجہ سے کیا بنی۔ حسن نے گھر پہنچ کر اطمینان کا سانس لیا اور دل میں تہیہ کر لیا کہ آئندہ وہ کبھی چوری نہیں کرے گا اور نہ ہی کبھی کیک کھائے گا۔ یوں حسن کی پہلی غلطی اس کی آخری غلطی بن گئی۔

## آخری گولی

مصنف: یوسف

وہ کل پانچ افراد تھے، تین مرد اور دو عورتیں۔ شام کے وقت ساحل سمندر کے ایک ویران گوشے میں، پتھروں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے دائیں طرف سمندر کی منہ زور لہریں ٹھانٹیں مار رہی تھیں اور بائیں طرف ایک اونچی پٹان سر اٹھائے کھڑی تھی، جو کسی پہاڑی کا باقی ماندہ حصہ تھی۔ چند قدم دور چار پانچ گاڑیاں کھڑی تھیں اس گروپ کے چیف کا نام تھا شفقت اگرچہ شفقت نام کی کوئی چیز اس کے چہرے پر دکھائی نہ دیتی تھی۔ وہ ایک ہٹا کٹا شخص تھا، چٹان کی طرح مضبوط اور پتھر کی طرح پتھریلا۔ چیف نے اچانک پہلو بدلا اور بولا:

"خواتین و حضرات آپ سب ملک کی خفیہ تنظیم کے ارکان ہیں۔ آپ کی مناسب کارکردگی کو مد نظر رکھ کر آپ کو ایک خفیہ مشن سونپا گیا۔ آپ میری ہدایات کے مطابق اپنا کام احسن طریقے سے سر انجام دیتے رہے مگر پھر ہم میں سے کسی نے ایک "کارنامہ" بھی سر انجام دے دیا، خفیہ سی ڈی کے چند منتخب حصے دشمن کے ہاتھوں فروخت کر دیے گئے۔"

چیف پھر اچانک خاموش ہو گیا وہ گرم نظروں سے ایک ایک کا چہرہ بڑھ رہا تھا، ہر ایک کو بری طرح گھور رہا تھا، بات ہی ایسی تھی، ملک سے غداری اور تنظیم سے بے وفائی۔ چیف نے سرد ہوا سے بچائو کے لیے عمدہ ادنیٰ منظر لے رکھا تھا۔ اس نے اپنا چرمی تھیلا کھول کر اس میں سے ایک سیاہ بڑا پستول نکالا۔ اس ماحول میں اس کی کرخت آواز پھر گونجی:

"غداری کی سزا موت ہوتی ہے، آپ سب جانتے ہیں کہ خفیہ ادارے غدار کو موت کے گھاٹ اتار کر دوسرے برے افراد کے لیے عبرت کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔ کیا کسی کو اس بات پر اعتراض تو نہیں کہ غدار کو مارا نہ جائے؟"

"نو چیف" چند ملی جلی آوازوں نے سر جھکا دیا۔  
"گلد تو گویا آپ سب اس تنظیم کے ایسے کارکن ہیں۔" چیف نے اپنی جیب میں سے تین گولیاں نکال کر پستول کو کھولا اور اس کے چیمبر میں وہ گولیاں ڈال دیں۔ پھر پستول کی نال ہوا میں بلند کی اور ٹریگر دبا دید۔ چیف نے دو گولیاں فضا میں چلا کر ضائع کر دیں۔ اب آخری گولی باقی تھی۔

"غدار کی قسمت کا فیصلہ اب یہ آخری گولی کرے گی۔" چیف نے زبان کھولی تو سب کے چہروں پر ایک رنگ آ کر گزر گیا۔ غدار کی نامزدگی کے بغیر ہر ایک شخص اپنے آپ کو مجرم اور غدار سمجھ رہا تھا کہ کہیں غداری کا اس پر کوئی الزام تو نہیں لگ گیا۔

چیف نے پستول دوبارہ کھول کر اس کا چیمبر گھما دیا

اور پھر اچانک پستول بند کر دیا۔ اس نے سب کو ترجیحی نگاہ سے دیکھ کر کہا۔ "معزز خواتین و حضرات آپ سب شریف، ایمان دار اور پارسا افراد ہیں۔ آپ ملک کی اس خفیہ تنظیم کے ساتھ بھی متعلق ہیں۔ میں کسی بھی فرد پر غداری کا الزام لگا کر اس پر کیچڑ اچھالنا نہیں چاہتا۔ کیوں کہ یہ بات بہت بڑا "گناہ" ہے کہ کسی پر بہتان باندھا جائے، لہذا میں اس آخری گولی کا ہی فیصلہ تسلیم کروں گا دیکھئے، یہ گولی کیا فیصلہ کرتی ہے۔ میں اس عمل کا آغاز خود سے کرتا ہوں۔ میری آپ سب کے لیے دلی دعا ہے کہ آخری گولی صرف غدار کا ہی کام تمام کرے۔ مجھے اس طریقے پر بھروسہ ہے۔ میں چند سال قبل بھی آخری گولی کی مدد سے غدار کو سزا دے چکا ہوں بلکہ قسمت غدار کو خود ہی ڈھونڈ لیتی ہے۔"

چیف نے پستول کی نالی اپنی کپٹی پر رکھی، آنکھیں بند کیں اور پستول کی لمبی دبا دی

"ٹک۔"

اس نے آنکھیں کھول کر خدا کا شکر ادا کیا اور پستول شاہ صاحب کے حوالے کیا۔ شاہ صاحب نے گہرا سانس لیا اور پستول کی نالی اپنے سر پر رکھ کر پستول چلا دیا

"ٹک۔"

شاہ صاحب جی کر مراٹھے تھے۔ انہوں نے تھکی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ پستول عبدالقیوم صاحب کے حوالے کر دیا۔ عبدالقیوم صاحب چار بچوں کے باپ تھے انہوں نے زیر لب خدا سے دعا کی۔ ساری دنیا ان کے سامنے پل بھر میں سمٹ آئی۔ وہ غدار تو نہیں تھے مگر اس آخری گولی کا بھلا کیا بھروسہ۔ انہوں نے خالق کائنات کو پکار کر پستول کی نالی اپنے ماتھے پر رکھی اور اس کی لمبی دبا دی۔

"ٹک۔"

وہ بچ گئے تھے۔ انہوں نے دل ہی دل میں شکرانے کے نفل ادا کرنے کا تہیہ کر لیا۔

پستول اب شمشہ کے ہاتھ میں تھا۔ شمشہ سخت گیر عورت دکھائی پڑتی تھی۔ عمر چالیس سال، تین بیٹوں کی ماں اور ایک بوڑھی بیمار ماں کی واحد خبر گیر۔ اس نے پستول تمام کر قدرے اکھڑے ہوئے لہجے میں کہا: "چیف میں غدار نہیں ہوں، آپ میرا ریکارڈ چیک کر لیں اور کوئی ثبوت مل جائے تو مجھے الٹا اڑکا کر میری چوڑی اتار دیں، پھر مجھے بھوکے کتوں کے آگے ڈال دیں۔"

"نہیں، آپ تو بہت اچھی ہیں۔" چیف نے طنز کیا۔

"تو پھر؟"

"پھر فیصلہ آخری گولی کا ہو گا، جو اس پستول کے چیمبر میں گھوم رہی ہے۔"

"چیف میرے تین چھوٹے چھوٹے بیٹے ہیں جو رات کے کھانے پر میرا انتظار کر رہے ہوں گے اور میری بوڑھی

ماں میرا حد درجہ شریف خاندان۔"

"اوہ آپ مجھے رلانے والی باتیں نہ کریں۔" چیف کی آواز بھی رندہ گئی۔ وہ اگرچہ اداکاری کر رہا تھا مگر کامیاب اداکاری کر رہا تھا۔

چیف کے بے لچک رویے اور بے لحاظ نظروں نے شمشہ کو بتا دیا کہ اس کا فیصلہ اٹل ہے۔ تب اس نے لرزتے ہاتھ سے پستول بلند لیا۔ پستول کی نالی اپنے سر پر رکھ لی اور کلمہ توحید کا ورد کرتے ہوئے لمبی دبا دی۔

آواز صرف "ٹک۔" کی ابھری

چیف نے اسے نئی زندگی کی مبارک باد دی، جو اس نے شکر یہ کے ساتھ قبول کی۔

پستول اب مس کرن کے پاس تھا۔ کرن تیس سالہ لڑکی تھی۔ اس کے چہرے پر حد درجہ معصومیت کا غلبہ تھا۔ چیف نے اسے نظر بھر کر دیکھا۔ آخری گولی اس پستول میں جہاں کہیں بھی تھی، گھوم گھام کر پستول کے نالی کے عین سامنے یا بالکل قریب آچکی تھی۔ پستول چار بار چلایا جا چکا تھا اور اب خطرہ نوے فیصد سے بھی بڑھ چکا تھا، آریا پار والا معاملہ تھا۔

"گولی چلائیں مس کرن" چیف نے اسے حکم دیا۔

تب پستول کرن کی گود میں پڑا تھا۔ اس نے شش و پنج میں مبتلا ہو کر پستول تمام لیا۔ اس نے ذرا ٹھہر کر کہا: "اندھی گولی کا فیصلہ اندھا ہوگا، میں نے کیا کیا ہے چیف کہ مجھے بھری جوانی میں موت کی گھاٹی میں دھکیلا جا رہا ہے۔"

چیف نے سخت لہجہ اختیار کیا: "اس پستول میں چھ گولیوں کی جگہ ہوتی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ آخری گولی اب نالی کے سامنے پہنچ چکی ہو۔ معاملہ اگرچہ بہت خطرناک تھا مگر میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کے بعد میں پستول کو اپنی کپٹی پر رکھ کر چلائوں گا اگر ایسا وقت یا تو" چیف نے ان سب کو دیکھ کر کہا۔ "میں خود کو سب سے پہلے سزاوار سمجھتا ہوں، اس لیے اس عمل کا آغاز میں نے خود سے کیا تھا اور انجام بھی وقت پڑنے پر خود ہی پر کروں گا مس کرن بے دھڑک گولی چلائیں اگر یہ غدار وطن نہ ہوئیں تو ان کی زندگی خواب نہیں ہو گی۔"

خوف زدہ کرن خاموش بیٹھی رہی۔

"مس کرن گولی چلائیں، اپنے چیف کا حکم ٹالنا بھی جرم ہے۔" پھر کرن نے اچانک ہاتھ سیدھا کیا اور گولی چلا دی۔ فضا دھماکے سے گونج اٹھی تھی۔ چٹان پر بیٹھے ہوئے آبی پرندے اور سمندری بگڑے اڑ گئے تھے۔ چیف جھج کر پتھر پر سے نیچے گرا تھا اور اس نے اپنا سینہ اپنے دونوں ہاتھوں سے تمام رکھا تھا۔ وہ کراہتے ہوئے ریت پر لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ کرن ماہر نشانہ انداز تھی وہ کئی بار نشانہ اندازی کے مقابلوں میں انعام حاصل کر چکی تھی۔ اس نے اپنے فن کا مظاہرہ چیف کے عین دل پر کیا تھا۔ چیف کا حکم نہیں ٹالا تھا۔ گولی تو چلائی تھی مگر اپنے سر پر نہیں، چیف کے سینے پر کرن نے وہ پستول پھینک

کر اپنے لباس میں سے ایک مائوزر نکال کر باقی ماندہ افراد پر تان لیا تھا تاکہ کوئی اسے روک نہ سکے۔ وہ اگلے قدموں پیچھے ہٹ رہی تھی تاکہ چند قدم دور جا کر اپنی گاڑی میں سوار ہو سکے۔ اس نے گھوم کر اپنی گاڑی کی طرف دیکھا اور یہی لمحہ قیامت بن گیا اچانک اسے کسی نے فضا میں گیند کی طرح اچھال دید۔ وہ منہ کے بل زمین پر گری تو مائوزر بھی اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ اس کو شاید صاحب نے اپنے پتھنے میں قابو کر لیا۔ اس پر حیرت کا پہلا ٹوٹ پڑا کہ خاک میں غلطاً چیف پتھر پر پاؤں دھرے کھڑا تھا اور اس کے لبوں پر زہریلی مسکراہٹ تھی۔ چیف کے ہاتھ میں ایک چھوٹا پستول تھا جو اس نے یقیناً اپنے اوئی مظہر میں سے نکالا تھا وہ آخری گولی سے بچ نکلا تھا۔

چیف نے کہا: "مجھے تجھ پر پہلے ہی یقین کی حد تک شک تھا۔ میری خفیہ اطلاع کے مطابق تو نے ہیروں والے زبورات خریدے ہیں اور دنیا کے ایک مہنگے شہر میں بنگلہ بھی۔ کرن بی بی وہ آخری گولی، پٹاخا گولی تھی۔ میں اتنا بے وقوف نہیں تھا کہ غدار تلاش کرنے کے لیے اندھی گولی کی مدد لیتا۔ میں نے جب جیمبر کو گھمایا تو بند کرتے وقت میں نے پستول کا جیمبر اپنے ہاتھ کے انگوٹھے کی مدد سے یوں روکا تھا کہ پٹاخا گولی پانچویں خانے میں تھی۔ میں نے تم لوگوں پر نفسیاتی حربہ استعمال کیا تھا اور یوں غدار لڑکی پکڑی گئی۔"

کرن جب تم مائوزر تمام کر قدم قدم، اگلے پاؤں پیچھے ہٹ رہی تھی تو میری طرف تیرا دھیان نہیں تھا اور جب تم نے گاڑی کی طرف پلٹ کر مجھے ایک لمحہ دیا تو میں نے تجھے اٹھا کر فضا میں اچھال دیا، شاید تیرے علم میں نہ ہو کہ میں ایک ماہر نفسیات ہوں اور نہجاً ماسٹر بھی۔"

## شیر اور گیدڑ کا مقدمہ، بندر کا

### انصاف

مصنف: یوسف

بہت عرصے قبل ایک شیر اور گیدڑ میں گہری دوستی تھی اور وہ دونوں ایک دوسرے کو حیران کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ ایک دن شیر نے ایک موٹی تازی بکری کو زندہ پکڑا اور اپنے دوست گیدڑ پر رعب جھاڑنے کے لیے جلدی جلدی اس کی بحث پر آیا لیکن جب وہ وہاں پہنچا تو حیرت سے اس کی آنکھیں کھلی رہ گئیں کیونکہ گیدڑ اس سے پہلے ہی ایک گائے کو پکڑے بیٹھا تھا۔ ”ایک گیدڑ شیر سے اچھا شکار کیسے کر سکتا تھا؟“ شیر نے غصے میں سوچا اور خاموشی سے بکری کو باہر گائے کے ساتھ باندھ کر سونے کے لیے چلا گیا کیونکہ رات کا فی ہونچکی تھی لیکن وہ ساری رات جاگتا رہا کیونکہ اسے حسد ہو رہا تھا کہ آخر گیدڑ نے گائے کو پکڑا کیسے۔ آخر کار اس سے رہا نہیں گیا تو سورج نکلنے سے پہلے ہی باہر نکل کر گائے کے پاس پہنچ گیا لیکن وہاں گائے کے ساتھ ایک بچھڑا بھی کھڑا تھا جسے رات میں ہی گائے نے جنم دیا تھا۔ بچھڑے کو دیکھتے ہی شیر کے ذہن میں ایک خیال آیا اور اس نے خود سے کہا ”میرے دوست کو دونوں کی ضرورت نہیں ہے۔“ یہ کہہ کر وہ بچھڑے کو بکری کے پاس لے گیا اور اسے اس کا دودھ پلانا شروع کر دیا اور صبح ہوتے ہی وہ چلاتا ہوا گیدڑ کے پاس گیا اور اس سے کہا ”جلدی چلو میرے ساتھ.... میری بکری نے رات میں بچھڑے کو جنم دیا ہے۔“ گیدڑ نے جب جا کر دیکھا تو بچھڑا بکری کا دودھ پنی رہا تھا۔ یہ دیکھ کر اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا: ”ناممکن“ ایک بکری کے یہاں گائے کا بچہ نہیں ہو سکتا۔ صرف گائے ہی بچھڑے کو پیدا کر سکتی ہے۔ یہ بچھڑا میرا ہے۔“

یہ بات سن کر شیر نے غراتے ہوئے کہا پاگل مت بنو۔ ثبوت تمہارے سامنے ہے۔ یہ دونوں ایک ساتھ کھڑے ہیں اور یہ بچھڑا میرا ہے۔“ ”نہیں میں اس ثبوت کو نہیں مانتا۔“ گیدڑ نے غصے سے جواب دیا اور پھر دونوں آپس میں لڑنے لگ گئے۔ اچانک شیر نے کہا ”ہم دونوں کسی کو منصف بنا کر اس بات کا فیصلہ کروا لیتے ہیں کہ یہ بچھڑا کس کا ہے؟ ٹھیک ہے لیکن میں تین لوگوں سے فیصلہ لوں گا۔ گیدڑ نے جواب دیا۔ شیر اس پر راضی ہو گیا اور وہ دونوں تین مختل مند جانوروں کو تلاش کرنے لگے جو ان کا فیصلہ کر سکیں۔ چلتے چلتے وہ ہرنوں کے ریوڑ کے پاس پہنچے جو درخت کے پتے کھا رہے تھے۔ کیا تمہارا رے ریوڑ میں کوئی عقل مند ہے؟“ شیر نے ان

کے قریب جا کر کہا۔ اس کی بات سن کر ایک بوڑھی ہرنی آگے بڑھی اور کہا اپنے ریوڑ کے بچھڑوں کا فیصلہ میں کرتی ہوں ، بولو کیا کام ہے؟ ہم ایک مسئلے کو حل کرنا چاہتے ہیں، یہ کہہ کر دونوں نے کہا یہ سنائی شروع کر دی۔ اب ان کی کہانی سن کر ہرنی سوچ میں پڑ گئی کیونکہ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ بکری بچھڑے کو پیدا نہیں کر سکتی لیکن وہ یہ بھی جانتی تھی کہ شیر بہت خطرناک جانور ہے۔ اسی لیے اس نے شیر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ بات سچ ہے کہ ہماری جوانی میں بکری بچھڑے کو جنم نہیں دے سکتی تھی اور یہ کام صرف گائے ہی کر سکتی تھی تاہم اب زمانہ بدل گیا ہے اور بکری بچھڑے کو جنم دے سکتی ہے اور میرا فیصلہ یہی ہے کہ یہ بچھڑا شیر کا ہے۔“

”کیا.... یہ نہیں ہو سکتا“ ہرنی کا فیصلہ سن کر گیدڑ نے غصے سے کہا۔ ”چلو اب دوسرے منصف کو ڈھونڈتے ہیں۔“ یہ کہہ کر دونوں نے دوسرے جانور کو ڈھونڈنا شروع کر دیا جو ان کو انصاف دلا سکے۔ چلتے چلتے وہ چٹانوں کی طرف پہنچ گئے ، جہاں انہیں ایک لکڑی بگڑ نظر آیا اور انہوں نے اسے سا راما سنا دیا۔ ان کی بات سن کر لکڑی بگڑ نے شیر کی طرف دیکھا۔ اسے یاد تھا کہ شیر اس کے بہت سارے دوستوں کو کھا چکا ہے ، اس لیے اس نے اپنا گلا صاف کرتے ہوئے کہا: ”سنو معمولی بکری ہی بکری کے بچے پیدا کر سکتی ہے لیکن غیر معمولی نسل کی بکری سب کچھ کر سکتی ہے اور یقیناً شیر کی بکری بہت غیر معمولی ہے اور اسی وجہ سے یہ بچھڑا بھی شیر ہی کا ہے۔“ ”تم پاگل ہو گئے ہو کیا؟“ گیدڑ نے غراتے ہوئے لکڑی بگڑ کو جواب دیا اور شیر سے کہا ”چلو اب ہمیں تیسرے انصاف کیلئے منصف کو تلاش کرنا ہے۔“ چلتے چلتے وہ ایک چٹان کے قریب پہنچے جہاں ایک بوڑھا بندر لیٹا ہوا تھا۔



”معاف کیجئے گا“ شیر نے بندر کا کندھا ہلاتے ہوئے کہا ”کیا آپ ہمارے بچھڑے کا منصفانہ فیصلہ کر سکتے ہیں؟“ یہ بات سن کر بندر نے باری باری دونوں کی بات سنی۔ ان کی بات ختم ہونے کے بعد بندر نے چٹان پر اوپر اوپر کچھ دیکھنا شروع کر دیا جیسے کچھ تلاش کر رہا ہو۔ ”کیا تم کھانے کے لیے کچھ ڈھونڈ رہے ہو؟“ شیر نے دھڑکتے ہوئے کہا ”ہمیں جلدی فیصلہ سنا؟ مجھے بہت بھوک لگ رہی ہے اور میں گھر جا کر اپنے بچھڑے کو کھانا چاہتا ہوں“ صبر کرو ابھی میں بہت مصروف

ہوں ”بندر نے جواب دہتے ہوئے کہا اور پتھر اٹھا لیا۔“ ”مصروف؟“ شیر نے غراتے ہوئے پوچھا ”کیا کر رہے ہو؟“ ”ساز بجا رہا ہوں میں ہمیشہ فیصلہ کرنے سے قبل تھوڑا سا سا

جانتے ہیں کہ پتھر سے موسیقی کی آواز نہیں نکل سکتی۔“ یہ بات سن کر بندر نے پتھر کو ایک طرف رکھا اور کہا ”اگر ایک بکری بچھڑے کو پیدا کر سکتی ہے تو پھر پتھر سے بھی موسیقی کی آواز آسکتی ہے اور تم نے سنا؟ کتنی سربلی موسیقی ہے“ یہ سن کر شیر ساری بات کو سمجھ گیا اور اس نے غراتے ہوئے کہا ”ہاں یہ آواز تو بہت خوبصورت ہے۔“ اس کی بات سن کر ارد گرد جمع ہونے والے سارے جانور بندر کی عقل مندی اور جرات کے قائل ہو گئے اور انہوں نے چلاتے ہوئے کہا ”بندر اس بچھڑے کا فیصلہ کر چکا ہے کہ صرف گائے ہی بچھڑے کو جنم دے سکتی ہے اور اس پر گیدڑ کا حق ہے۔“ اب تمام جانوروں نے شیر کو لعن طعن شروع کر دی کہ وہ اپنے دوست کو دھوکا دے رہا تھا۔ یہ ماجرا دیکھ کر شیر نے شرم سے سر جھکا لیا اور واپس جا کر گیدڑ کو گائے کا بچہ واپس کر دیا۔



## آشیانہ

آ رہی مگر اس وقت واقعی بہت بڑی چیزیں لگ رہی تھیں۔ ذرا  
آٹھ سالہ بچے کے ذہن سے سوچیں! اور صورت حال کچھ یوں  
تھی کہ ہم شہر کے مضافاتی علاقے میں رہتے تھے بارہ میل دور  
! جہاں آج کل بڑے بڑے شاہنگ سنفرز، دفاتر اور تعلیمی  
ادارے ہیں وہاں گھنا جنگل تھا ہوا کر تا تھا سڑک کے دونوں  
جانب! نزدیک ترین شاہنگ سینفر صدر ہوا کر تا تھا جہاں صرف  
اسٹاف بس کے ذریعے جایا جا سکتا تھا جو مقررہ اوقات میں ہی  
چلا کرتی تھی۔ امی جان پہلی بس سے ہی ہمارا سامان لانے روانہ  
ہو گئیں۔

اس سامان کو دیکھ کر جو کیفیت ہوئی وہ آج بھی یاد ہے۔ خوشی  
بھرا اضطراب! جیسے عید کا انتظار ہوتا ہے کپڑے اور جوتے سامنے  
رکھ کر! جب مطلوبہ پیریز شروع ہوا تو کچھ یوں منظر نامہ تھا کہ  
تقریباً بیچیں بچوں اور بچوں میں سے ہم واحد تھے جو پینٹنگ کا  
سامان لے کر آئے تھے باقی سب خالی ہاتھ سر جھکائے کھڑے  
تھے۔ ٹیچر نے پوری کلاس کو نافرمان کا خطاب دیا اور ہمیں اپنی  
میز پر بلا کر ڈرائنگ سکھانے لگیں۔ جس وقت وہ ہم پر تعریف  
کے ڈونگے برسا رہی تھیں اسی وقت پر نپل بھی کابیزور سے  
گریز۔ ٹیچر نے انہیں بتایا تو وہ بھی ہماری کلاس کو ڈانٹنے لگیں۔  
اچھی طرح یاد ہے کہ اس وقت ذرا بھی فخریہ احساس نہیں  
تھا۔ یوں تو اپنی تعریف ہر ایک کو پسند ہوتی ہے مگر اس طرح  
نمائاں ہونے میں انسان کتنا تنہا ہوتا ہے!!! کیا خیال  
ہے؟ شام کو اپنے پڑوسی ہم جماعت کے گھر کھیل رہے تھے۔ اس  
نے اپنی امی سے شکایت کی کہ مجھے رنگ کیوں نہیں ملتا کہ  
دیئے آپ نے.....! اور جناب ہمارے سامنے ہی اسکی بڑی بہن  
نے اس کے کان اٹھتے ہی کہہ کر ”تم خود کتنے خراب لڑکے  
ہو! تمہیں کچھ آتا بھی ہے! اس کو دیکھو کتنی اچھی پٹی ہے  
.....“ یقین کریں میرا دل چاہ رہا تھا میں اپنے رنگ اسے  
دے دوں! اب اس وقت کے درست جذبات تو ذہن میں  
نہیں ہیں مگر اب سوچتے ہیں کیا حقیقی تعریف کی حقدار میری  
امی نہیں تھیں جنہوں نے مجھے مطلوبہ چیزیں اہمیت کے ساتھ  
مہیا کیں؟؟ آج ہم اس بات کا اظہار کر رہے ہیں مگر اس وقت  
تو یقیناً امی کا شکریہ ادا نہیں کیا ہو گا!

اس واقعے کا ڈراپ سین یہ ہوا کہ ہمارے چھوٹے بھائی نے جو  
ابھی اسکول نہیں جاتے تھے ایک دن موقع پا کر تمام رنگ  
خراب کر دیے۔

اسکول سے واپسی پر جب ہم نے دیکھا تو جو رونا شروع کیا وہ  
کئی دنوں بعد ہی ختم ہو سکا۔ یہ انسانی فطرت ہے جب کوئی  
نعت ملتی ہے تو اپنے آپ کو اس کا حق دار سمجھتا ہے اور جب  
چھین جائے تو واپس کرتا ہے۔

بچپن کی یادوں میں ایک اہم واقعے میں مجھ کو کا شکریہ! یہ کیا با  
ت ہوئی ہے تو انسان کو تکلیف دینے والا شش پایہ ہے جو احسان  
کا جواب بھی ڈنک مار کر دیتا ہے اس کا شکریہ کیوں؟؟

لطیفہ بنانا اس وقت تو دلچسپ لگ رہا ہے مگر اُس عمر میں تو رو رو  
کر برا حال ہوتا جب بھی ہنس ہنس کر یہ واقعہ سنا یا جاتا۔  
جہاں تک شوق کا معاملہ ہے ہر بچے کی طرح ہمیں بھی کہانیاں  
سننا بہت پسند تھا۔ دلاوی جان سال کا آدھا حصہ ہمارے گھر اور  
بقیہ آدھا بڑے ابا کے گھر حیدر آباد میں گزارتی تھیں۔ بچوں  
اور بوڑھوں کی دوستی تو ویسے بھی ضرب المثل ہے کیونکہ ان  
دونوں اقوام کو ہی اصول و قواعد کے کڑے امتحان سے گزرنا پڑ  
تا ہے ہیں اور جو ”لوگ کیا کہیں گے!“ کے بجائے ”جہاں اور  
جیسا ہے“ کی پالیسی پر یقین رکھتی ہیں۔ لہذا ہم بھی اپنی دلاوی  
جان کا انتظار ان کے جاتے ہی شروع کر دیتے تھے۔ اہم ترین  
وجہ ان کی کہانیاں ہوتیں جو ہم رات کو ان کے بستر کے گرد  
بیٹھ کر سنا کرتے تھے۔ چونکہ پڑھنے اور خصوصاً کہانیاں پڑھنے  
کے بہت شوقین تھے۔ اسلئے موسم اور حالات کی پرواہ کئے بغیر  
دیواروں پر لکھے اشتہارات تک بڑے غور سے پڑھتے۔ اس چکر  
میں بعض انہونی نہ ہو سکی کہ کئی دفعہ ہم بازار میں بچھڑنے سے  
بچے۔

نیک پریوں کی کہانیاں بے دریغ پڑھنے سننے کا نتیجہ تھا کہ  
ہم عام زندگی میں بھی کہانیوں کی تکنیک استعمال کرنے کی کو  
شش کرتے تھے۔ یعنی یہ دیکھ کر کہ برادران امی کو ستا رہے  
ہیں۔ کبھی بات نہ مان کر تو کبھی شرارتوں میں! محلے والوں کی  
شکایتیں سن کر امی بے چاری پریشان ہو رہی ہیں۔ اس معاملے  
میں ہمارے نہ کوئی اختیارات تھے نہ حقوق! نہ وسائل نہ طاقت  
! ہاں مگر ایک ہتھیار تھا! قلم کی قوت! کسی پری کی طرف  
سے اپنے اس بھائی کے نام خط لکھتے جس نے کوئی نامعلوم ح  
کت کی ہو۔ مدعا یہ ہوتا کہ تم نے فلاں فلاں غلط حرکت کی  
ہے لہذا تمہیں میری طرف سے انعام نہیں ملے گا..... اب  
آپ خود سوچیں ایک بری سی پیڈ رائٹنگ میں بچگانہ اسٹائل میں  
کی گئی بات کتنے مزاح کا باعث بنتی ہوگی؟ اس وقت آپ سے  
یہ شیر کرنا اتنا برا نہیں لگ رہا مگر اس وقت بڑی شرمندگی  
لگتی تھی حالانکہ یہ تذکرہ ہماری تعریف میں ہی ہوتا تھا۔ بذریعہ  
قلم اصلاح معاشرہ کے جراثیم ہمارے اندر گویا شروع سے ہی  
تھے۔ ہاں شعوری طور پر جب اس کا آغاز کیا تو ظاہر ہے اس کی  
بنیاد کوئی مہر بان، نیک پری نہیں بلکہ رضائے الہی ہو گئی۔

بچپن کا ایک واقعہ جو یاد آتا ہے اس وقت کا ہے جب ہم  
جماعت سوم میں پڑھتے تھے۔ ہماری آرٹ ٹیچر نے اعلان کیا  
کہ آئندہ وہ ہمیں واٹر کالر سکھائیں گی۔ ہر بچے کی طرح ہمیں  
بھی ڈرائنگ سے بڑا شغف تھا۔ لہذا گھر پہنچتے ہی امی کو یہ خوشی  
بھری اطلاع دی اور ساتھ ہی وہ فہرست بھی پکڑائی جو مس نے  
منگوائی تھی۔ پینٹ برش اور رنگ کے علاوہ رنگ گھولنے کے  
لئے پلاسٹک کے پیالے، اسپرن اور فالٹو کپڑے وغیرہ آج تو  
اس میں سے کوئی بھی چیز پینٹ سے باہر نظر نہیں

## ہائے میرا بچپن!!!!

مصنف: یوسف

بچپن کا حساب کچھ یوں ہے کہ جوں جوں انسان بچپن کی طرف  
بڑھتا جاتا ہے بچپن زیادہ یاد آنا شروع ہو جاتا ہے۔ یوں تو  
ایک خاص دور کے بچوں کا بچپن تقریباً یکساں ہی ہوتا ہے مگر  
چونکہ ہر فرد منفرد ہے تو ہر ایک کا علیحدہ کہانی ہو گی۔ آج سے  
تین چار عشرے قبل کے بچے معصوم ہوا کرتے تھے مگر ہم کچھ  
زیادہ ہی تھے یا پھر شریر بھائیوں کی موجودگی کی وجہ سے بنا  
دے گئے تھے۔



ایک واقعہ یاد آ رہا ہے جو کچھ یوں ہے کہ اس وقت ہماری عمر  
سات آٹھ سال ہوگی۔ جب ایک دن صبح دلاوی جان نے ہمیں  
چوٹی (آج کے بچوں کو کیا معلوم؟ ان کے لئے عرض ہے کہ  
چوٹی ایک روپے کا چھوٹا یعنی چار آنے ہوتے تھے۔ آج کے  
دس روپوں کے ہم پلہ سمجھ لیں) دی کہ سامنے والے کھوکھے  
سے انڈے لے آؤ۔ ہماری ہاتھیں کھل انھیں اور اپنے پچھلے  
دن کے بارے میں سوچنے لگے کہ دلاوی کی اس خاص مہربانی  
ہماری کس بات کا انعام ہے! جلدی سے sweet egg کا ڈبہ ( )  
یہ ہمارے بچپن کی خاص چیز تھی۔ میٹھی باریک انڈوں کی شکل  
کی گولیاں جو ایک موبائیل کے سائز کے ڈبے میں ہوتی  
تھیں۔ اس ڈبے پر چھتری تلے مرغی کی تصویر ہوتی تھی ہلانے پر  
میٹھے انڈے پھٹتی پڑ گرتے تو بس..... کیا مصیبت ہے!  
بچپن کا حال لکھیں تو ہر چیز explain کر کے بتائیں کہ آج  
وہ چیزیں ہی ناپید ہو گئیں! بھاگ کر لائے اور لان میں ہی بیٹھ کر  
کھانے لگے ایسا نہ ہو کہ برادران میں سے کوئی آپک لے اور  
خواہ مخواہ بھارا کرنا پڑے! بڑوں کی دھونس تو چھوٹوں کی ضد  
دونوں ہی خطرناک تھے اس معاملے میں! ڈبہ ختم کر کے جب  
اندر آئے تو دلاوی نے ہمارے خالی ہاتھ کو دیکھا اور انڈوں کا  
پوچھا تو صورت حال واضح ہوئی کہ وہ بیچاری آلیٹ کے لئے پیاز  
کاٹ کر منتظر تھیں کہ ہمارے آنے پر ناشتے کا انتظام ہو! جی  
نہیں! ڈانٹ نہ پٹائی کچھ بھی نہ ہوا ہاں مگر اپنا

قصہ کچھ یوں ہے کہ ہم سارے بچے اسکول بس کے ذریعے اپنے اپنے اسکول جایا کرتے تھے۔ یہ رواج تو آج بھی ہے کہ بچے شہر کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک جاتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ اس زمانے میں دور دراز جانے کی وجہ اسکولوں کا گھروں سے فاصلے پر ہونا ہوتا تھا اسٹینڈرڈ ہر گز نہیں تھے۔

تو جناب! ہماری ایک بس کی ساتھی نے ایک دن ہمیں بتایا کہ ان کے اسکول میں اردو پاکستانی فلم دکھائی جائے گی۔ اس زمانے کے بچوں اور نوجوان نسل کے لئے سینما جاکر فلم دیکھنا بہت بڑی تفریح ہوا کرتی تھی اسج کی طرح نہیں کہ فلم just a click پر ہو! بہت سے خاندانوں میں یہ شجر ممنوعہ ہوا کرتی تھی۔ شیطان اس وقت بھی اپنے تمام حربوں کے ساتھ میدان میں ہوتا تھا لہذا مختلف تعلیمی اداروں میں اس کو دکھانے کا ہتھام کیا جاتا کہ کوئی محروم نہ رہے۔ ساتھی کی اس خبر پر ہمارا بھی بہت دل لپا یا اور نہ جانے کس طرح امی سے اجازت اور ٹکٹ کے پیسے لئے یہ غیر ضروری بات ہے۔

اصل واقعہ یہ ہے کہ اس دن ہم اپنی دوست کے اسکول میں فلم دیکھنے جانے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ جوتا پہنتے ہوئے بری طرح تکلیف ہونے لگی جب ہمارا جوتا اتر وایا گیا تو وہاں بچھو صاحب آرام فرما رہے تھے اور ہمارے انگوٹھے پر ڈنک مار مار کر ہمارا شکریہ ادا کر رہے تھے۔ آگے آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں! ہمیں فوری طور پر ٹریٹمنٹ دی گئی۔ تکلیف اور فلم نہ دیکھنے کا افسوس ساتھ ساتھ رہے۔ یہ واقعہ پڑھ کر آپ کو یقین آگیا ہوگا کہ ہم نے اس کا شکریہ درست ادا کیا تھا کہ اس نے ہمیں ڈنک مار کر فلم دیکھنے سے بچا کر نہ صرف ہماری معصومیت کو دغا دار ہونے سے بچایا بلکہ سنت کے مطابق چیزوں کو جھاڑ کر استعمال کرنے کی عادت ڈلوائی

میرا خیال ہے کہ بچپن نمبر کے لئے اتنے ہی واقعات بہت ہیں! ہمارا بچپن ہمارے دور کی جھلک ہے! کیسا لگا یہ دور؟؟

## حکیم صاحب

مصنف: یوسف

دوائیاں دکھائیں اور ساری بات بتائی تو بے اختیار اس کے منہ سے نکلا وہ انسان نہیں کوئی فرشتہ ہے اور اس کی دی ہوئی ادویات ہمارے من کی مراد پوری کرنے کا باعث بنیں گی۔ حکیم صاحب آج میرے گھر میں تین پھول اپنی بہار دکھا رہے ہیں۔

ہم میاں بیوی ہر وقت آپ کے لیے دعائیں کرتے رہتے ہیں۔ جب بھی پاکستان چھٹی آئی۔ کار اوھر روکی لیکن دکان کو بند پایا۔ میں کل دوپہر بھی آیا تھا آپ کا مطب بند تھا۔ ایک آدمی پاس ہی کھڑا ہوا تھا۔ اُس نے کہا کہ اگر آپ کو حکیم صاحب سے ملنا ہے تو آپ صبح ۹ بجے لازماً پہنچ جائیں ورنہ اُن کے ملنے کی کوئی گارنٹی نہیں۔ اس لیے آج میں سویرے سویرے آپ کے پاس آ گیا ہوں۔

محمد علی نے کہا کہ جب ۱۵ سال قبل میں نے یہاں آپ کے مطب میں آپ کی چھوٹی سی بیٹی دیکھی تھی تو میں نے بتایا تھا کہ اس کو دیکھ کر مجھے اپنی بھانجی یاد آ رہی ہے۔

حکیم صاحب ہمارا سارا خاندان انگلینڈ سیٹل ہو چکا ہے۔ صرف ہماری ایک بیوہ بہن اپنی بیٹی کے ساتھ پاکستان میں رہتی ہے۔ ہماری بھانجی کی شادی اس ماہ کی ۲۱ تاریخ کو ہونا تھی۔ اس بھانجی کی شادی کا سارا خرچ میں نے اپنے ذمہ لیا تھا۔ ۱۰ دن قبل اسی کار میں اسے میں نے لاہور اپنے رشتہ داروں کے پاس بھیجا کہ شادی کے لیے اپنی مرضی کی جو چیز چاہے خرید لے۔ اسے لاہور جاتے ہی بخار ہو گیا لیکن اس نے کسی کو نہ بتایا۔ بخار کی گولیاں ڈسپینر وغیرہ کھاتی اور بازاروں میں پھرتی رہی۔ بازار میں پھرتے پھرتے اچانک بے ہوش ہو کر گری۔ وہاں سے اسے ہسپتال لے گئے۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ اس کو ۱۰۶ ڈگری بخار ہے اور یہ گردن توڑ بخار ہے۔ وہ بے ہوشی کے عالم ہی میں اس جہان فانی سے کوچ کر گئی۔

اُس کے فوت ہوتے ہی نجانے کیوں مجھے اور میری بیوی کو آپ کی بیٹی کا خیال آیا۔ ہم میاں بیوی نے اور ہماری تمام فیملی نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم اپنی بھانجی کا تمام جہیز کا سامان آپ کے ہاں پہنچا دیں گے۔ شادی جلد ہو تو اس کا بندوبست خود کریں گے اور اگر ابھی کچھ دیر ہے تو تمام اخراجات کے لیے رقم آپ کو نقد پہنچا دیں گے۔ آپ نے ناں نہیں کرنی۔ آپ اپنا گھر دکھا دیں تاکہ سامان کا ٹرک وہاں پہنچایا جا سکے۔

حکیم صاحب حیران و پریشان یوں گویا ہوئے ”محمد علی صاحب آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں مجھے سمجھ نہیں آ رہا، میرا اتنا دماغ نہیں ہے۔ میں نے تو آج صبح جب بیوی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی چٹ یہاں آ کر کھول کر دیکھی تو مروج سالہ کے بعد جب میں نے یہ الفاظ پڑھے ”بیٹی کے جہیز کا سامان“ تو آپ کو معلوم ہے میں نے کیا لکھا۔ آپ خود یہ چٹ ذرا دیکھیں۔ محمد علی صاحب یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ”بیٹی کے جہیز“ کے سامنے لکھا ہوا تھا ”یہ کام اللہ کا ہے، اللہ جانے۔“

پر رحم آگیا تھا اور وہ میرا گھر آباد کرنا چاہتا تھا۔ ہوا اس طرح تھا کہ میں لاہور سے میرپور اپنی کار میں اپنے آبائی گھر جا رہا تھا۔ عین آپ کی دکان کے سامنے ہماری کار پکچر ہو گئی۔

ڈرائیور کار کا پیہر اتار کر پنچر لگوانے چلا گیا۔ آپ نے دیکھا کہ میں گرمی میں کار کے پاس کھڑا ہوں۔ آپ میرے پاس آئے اور آپ نے مطب کی طرف اشارہ کیا اور کہا کہ اوھر آ کر کرسی پر بیٹھ جائیں۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ میں نے آپ کا شکریہ ادا کیا اور کرسی پر آ کر بیٹھ گیا۔

ڈرائیور نے کچھ زیادہ ہی دیر لگ دی تھی۔ ایک چھوٹی سی بچی بھی یہاں آپ کی میز کے پاس کھڑی تھی اور بار بار کہہ رہی تھی ”دپٹیں ناں، مجھے بھوک لگی ہے۔ آپ اُسے کہہ رہے تھے بیٹی تھوڑا صبر کرو ابھی چلتے ہیں۔“

میں نے یہ سوچ کر کہ اتنی دیر سے آپ کے پاس بیٹھا ہوں۔ مجھے کوئی دوائی آپ سے خریدنی چاہیے تاکہ آپ میرے منٹھے کو زیادہ محسوس نہ کریں۔ میں نے کہا حکیم صاحب میں ۵۰۶ سال سے انگلینڈ میں ہوتا ہوں۔ انگلینڈ جانے سے قبل میری شادی ہو گئی تھی لیکن ابھی تک اولاد کی نعت سے محروم ہوں۔ یہاں بھی بہت علاج کیا اور وہاں انگلینڈ میں بھی لیکن ابھی قسمت میں مایوسی کے سوا اور کچھ نہیں دیکھا۔

آپ نے کہا میرے بھائی! توبہ استغفار پڑھو۔ خدا را اپنے خدا سے مایوس نہ ہو۔ یاد رکھو! اُس کے خزانے میں کسی شے کی کمی نہیں۔ اولاد، مال و اسباب اور غنی خوشی، زندگی موت ہر چیز اسی کے ہاتھ میں ہے۔ کسی حکیم یا ڈاکٹر کے ہاتھ میں شفا نہیں ہوتی اور نہ ہی کسی دوا میں شفا ہوتی ہے۔ شفا اگر ہوتی ہے تو اللہ کے حکم سے ہوتی ہے۔ اولاد دینی ہے تو اسی نے دینی ہے۔

مجھے یاد ہے آپ باتیں کرتے جا رہے اور ساتھ ساتھ پڑیاں بنا رہے تھے۔ تمام دوائیاں آپ نے ۲ حصوں میں تقسیم کر کے ۲ لفافوں میں ڈالیں۔ پھر مجھ سے پوچھا کہ آپ کا نام کیا ہے؟ میں نے بتایا کہ میرا نام محمد علی ہے۔ آپ نے ایک لفافہ پر محمد علی اور دوسرے پر بیگم محمد علی لکھا۔ پھر دونوں لفافے ایک بڑے لفافہ میں ڈال کر دوائی استعمال کرنے کا طریقہ بتایا۔ میں نے بے دلی سے دوائی لے لی کیونکہ میں تو صرف کچھ رقم آپ کو دینا چاہتا تھا۔ لیکن جب دوائی لینے کے بعد میں نے پوچھا کتنے پیسے؟ آپ نے کہا بس ٹھیک ہے۔ میں نے زیادہ زور ڈالا، تو آپ نے کہا کہ آج کا کھانا بند ہو گیا ہے۔

میں نے کہا مجھے آپ کی بات سمجھ نہیں آئی۔ اسی دوران وہاں ایک اور آدمی آچکا تھا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ کھانا بند ہونے کا مطلب یہ ہے کہ آج کے گھریلو اخراجات کے لیے جتنی رقم حکیم صاحب نے اللہ سے مانگی تھی وہ اللہ نے دے دی ہے۔ مزید رقم وہ نہیں لے سکتے۔ میں کچھ حیران ہوا اور کچھ دل میں شرمندہ ہوا کہ میرے کتنے گھنٹیا خیالات تھے اور یہ سلاہ سا حکیم کتنا عظیم انسان ہے۔ میں نے جب گھر جا کر بیوی کو

پنجاب کے شہر گجراتولا میں ایک حکیم صاحب ہوا کرتے تھے، جن کا مطب ایک پرانی سی عمارت میں ہوتا تھا۔ حکیم صاحب روزانہ صبح مطب جانے سے قبل بیوی کو کہتے کہ جو کچھ آج کے دن کے لیے تم کو درکار ہے ایک چٹ پر لکھ کر دے دو۔ بیوی لکھ کر دے دیتی۔ آپ دکان پر آ کر سب سے پہلے وہ چٹ کھولتے۔ بیوی نے جو چیزیں لکھی ہوتیں۔ اُن کے سامنے اُن چیزوں کی قیمت درج کرتے، پھر اُن کا ٹوٹل کرتے۔ پھر اللہ سے دعا کرتے کہ یا اللہ! میں صرف تیرے ہی حکم کی تعمیل میں تیری عبادت چھوڑ کر یہاں دنیا داری کے پیکروں میں آ بیٹھا ہوں۔ جو ہی تو میری آج کی مطلوبہ رقم کا بندوبست کر دے گا۔ میں اسی وقت یہاں سے اُٹھ جائوں گا اور پھر یہی ہوتا۔ کبھی صبح کے ساڑھے نو، کبھی دس بجے حکیم صاحب مریضوں سے فارغ ہو کر واپس اپنے گاؤں چلے جاتے۔

ایک دن حکیم صاحب نے دکان کھولی۔ رقم کا حساب لگانے کے لیے چٹ کھولی تو وہ چٹ کو دیکھنے کے دیکھتے ہی رہ گئے۔ ایک مرتبہ تو ان کا دماغ گھوم گیا۔ اُن کو اپنی آنکھوں کے سامنے تارے چمکتے ہوئے نظر آ رہے تھے لیکن جلد ہی انھوں نے اپنے اعصاب پر قابو پا لیا۔ اُٹے دال وغیرہ کے بعد بیگم نے لکھا تھا، بیٹی کے جہیز کا سامان۔ کچھ دیر سوچتے رہے بھشکر۔“ چیزوں کی قیمت لکھنے کے بعد جہیز کے سامنے لکھا ”یہ اللہ کا کام ہے اللہ جانے۔“

ایک دو مریض آئے ہوئے تھے۔ اُن کو حکیم صاحب دوائی دے رہے تھے۔ اسی دوران ایک بڑی سی کار اُن کے مطب کے سامنے آ کر رکی۔ حکیم صاحب نے کار یا صاحب کار کو کوئی خاص توجہ نہ دی کیونکہ کئی کاروں والے ان کے پاس آتے رہتے تھے۔

دونوں مریض دوائی لے کر چلے گئے۔ وہ سوئڈنلینڈ صاحب کار سے باہر نکلے اور سلام کر کے بچ پر بیٹھ گئے۔ حکیم صاحب نے کہا کہ اگر آپ نے اپنے لیے دوائی لینے ہے تو اوھر سٹول پر آجائیں تاکہ میں آپ کی نبض دیکھ لوں اور اگر کسی مریض کی دوائی لے کر جاتی ہے تو بیماری کی کیفیت بیان کریں۔

وہ صاحب کہنے لگے حکیم صاحب میرا خیال ہے آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔ لیکن آپ مجھے پہچان بھی کیسے سکتے ہیں؟ کیونکہ میں ۱۵، ۱۶ سال بعد آپ کے مطب میں داخل ہوا ہوں۔ آپ کو گزشتہ ملاقات کا احوال سنا ہوں پھر آپ کو ساری بات یاد آجائے گی۔ جب میں پہلی مرتبہ یہاں آیا تھا تو وہ میں خود نہیں آیا تھا۔ خدا مجھے آپ کے پاس لے آیا تھا کیونکہ خدا کو مجھ

محمد علی صاحب یقین کریں، آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ  
بیوی نے چٹ پر چیز لکھی ہو اور مولا نے اُس کا اسی دن  
بندوبست نہ کر دیا ہو۔ واہ مولا واہ۔ تو عظیم ہے تو کریم ہے۔  
آپ کی بھانجی کی وفات کا صدمہ ہے لیکن اُس کی قدرت پر  
حیران ہوں کہ وہ کس طرح اپنے معجزے دکھاتا ہے۔  
حکیم صاحب نے کہا جب سے ہوش سنبھالا ایک ہی سبق پڑھا کہ  
”صبح ورد کرنا ہے“ رازق، رازق، تو ہی رازق“ اور شام کو ”شکر،  
شکر مولا تیرا شکر

---

§§§

---

## اردو ادب کا ایک نام۔ ابن انشاء

مصنف: یوسف

یہ کاج نہیں بنجارسے کا  
تم ایک مجھے بہتری ہو  
اک بار کہو تم میری ہو

ابن انشاء 1962ء میں نیشنل بک کونسل کے ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ اس کے علاوہ ٹوکیو بک ڈویلپمنٹ پروگرام کے وائس چیرمین اور ایشین کو پبلی کیشن پروگرام ٹوکیو کی مرکزی مجلس ادارت کے رکن بھی مقرر ہوئے۔ 1969ء میں آپ نے دوسری شادی کی دوسری بیگم کا نام شکیلہ بیگم تھا۔ دوسری بیوی سے آپ کے دو بیٹے سعدی اور رومی پیدا ہوئے۔ کسی حد تک یہ پسند کی شادی تھی۔ ابن انشاء کی شاعری میں ایک جلوہ ہے۔ ان کی بات ہی الگ ہے۔ کیا کمال کا شاعر تھا اور کیا کمال کی شاعری ہے۔

دل بھر کے درد سے بوجھل ہے، اب آن ملو تو بہتر ہو  
اس بات سے ہم کو کیا مطلب، یہ کیسے ہو، یہ کیونکر ہو  
انشاء جی اب اجنبیوں میں چین سے باقی عمر کٹے  
جن کی خاطر بستی چھوڑی نام نہ لو ان پیاروں کا

ان کی چند کتابوں کے نام درج ذیل ہیں۔ آوارہ گرد کی ڈائری۔ دنیا گول ہے۔ ابن بطوطہ کے تعاقب میں۔ چلنے ہو تو چین کو چلئے۔ نگری نگری پھرا مسافر۔ آپ سے کیا پردہ۔ شمار گندم۔ اردو کی آخری کتاب۔ خط انشا جی کے۔ اس کے علاوہ آپ نے متعدد تراجم بھی کیے (اندھا کتواں اور دیگر پر اسرار کہانیاں۔ مجبور۔ لاکھوں کا شہر۔ شہر پناہ چینی نظمیں، سانس کی پھانس، وہ بیضوی تصویر، عطر فروش دو شہرہ کے قتل کا معرہ، قصہ ایک کنوارے کا۔ کارنامے ناب تیس مار خان کے۔ شلم کیسے اکھڑا بچوں کیلئے ایک پرانی روسی کہانی کا ترجمہ۔ یہ بچے کس کا بچے ہے؟۔ قصہ دم کٹے چوہے کا۔ میں دوڑتا ہی دوڑتا۔ اختر کی یو میں، اور شاہ عبداللطیف بھٹائی کی سندھی شاعری کا اردو ترجمہ بھی کرنے کا بھی اعزاز ابن انشاء نے ہی حاصل کیا۔

انشاء جی اٹھو اب کوچ کرو، اس شہر میں جی کو لگانا کیا  
وحشی کو سکوں سے کیا مطلب، جوگی کا نگر میں ٹھکانہ کیا

انشاء جی اٹھو اب کوچ کرو نظم کہنے کے ایک ماہ بعد ابن انشاء کی وفات ہوئی۔ اردو ادب کا یہ بے حد مقبول و اہم شاعر و ادیب، مزاح نگار، جس نے اپنی زندگی کے زیادہ تر ایام حالانکہ اپنے شہر کراچی، لاہور یعنی پاکستان میں گزارے، مگر جب اجل کا وقت قریب آیا تو وہ اپنے وطن سے سات سمندر پار انگلستان میں مقیم تھے۔ وہیں انہوں نے 11 جنوری 1978ء کو لندن میں وفات پائی اور پاپوش نگر قبرستان، کراچی میں آسودہ خاک ہیں۔ یہ عظیم شاعر و ادیب افسانہ نگار ابن انشاء جسمانی طور پر ہمیشہ کے لیے اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اس دنیا سے رخصت ہوئے 39 برس بیت گئے ہیں مگر وہ اپنی تخلیقات کے ذریعہ آج بھی زندہ ہے۔

جب دیکھ لیا ہر شخص یہاں ہر جا جی ہے

اس شہر سے دور

اک کلتیا ہم نے بنائی ہے

اس اس کلتیا کے ماتھے پر لکھوایا ہے

سب مایا ہے۔۔۔!!!

اردو ادب کے مایہ ناز شاعر، ادیب ابن انشاء کا اصلی نام شیر محمد خان تھا لیکن ابن انشاء کے نام سے مشہور ہوئے۔ 15 جون 1927ء کو جالندھر کے ایک نواحی گاؤں کے راجپوت گھرانے میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام منشی خان تھا۔ ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں کے سکول میں، مڈل نزدیکی گاؤں کے سکول سے اور 1941ء میں گورنمنٹ ہائی سکول لدھیانہ سے میٹرک کا امتحان پاس کیا، میٹرک میں اول پوزیشن حاصل کی۔ ابن انشاء کو صحافت، علم و ادب سے دلچسپی تھی، اس وقت "نوائے وقت" ہفت روزہ تھا، حمید نظامی صاحب سے خط و کتابت تھی، انہوں نے ایک خط میں حمید نظامی صاحب (مرحوم) سے لاہور آ کر "نوائے وقت" میں ملازمت اختیار کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ حمید نظامی کے مشورے پر ابن انشاء لاہور آ گئے اور اسلامیہ کالج لاہور میں فرسٹ ایئر میں داخلہ لے لیا، ان کی رہائش کا بندوبست جناب حمید نظامی نے کیا مگر تین مہینے کے مختصر قیام کے بعد ابن انشاء اپنی طبیعت کے مطابق اور کچھ دیگر وجوہات کے سبب تعلیم اوصوری چھوڑ کر لدھیانہ چلے گئے۔

وہاں بھی بھنورے نے کہاں رہنا تھا، لدھیانہ سے انبالہ چلے گئے، وہاں ملٹری اوکوائس کے دفتر میں ملازمت اختیار کر لی۔ لیکن جلد ہی یہ ملازمت بھی چھوڑ دی اور دلی چلے گئے۔ اس دوران میں آپ نے ادیب فاضل اور منشی فاضل کے امتحانات پاس کرنے کے بعد پرائیویٹ طور پر بی اے کا امتحان پاس کر لیا تھا۔ ابن انشاء ذہین تھے، تھوڑے عرصے بعد انہیں اسمبلی ہاؤس میں مترجم کی حیثیت سے ملازمت مل گئی۔ بعد ازاں آل انڈیا ریڈیو کے نیوز سیکشن میں خبروں کے انگریزی بلٹین کے اردو ترجمے پر مامور ہوئے اور قیام پاکستان تک وہ آل انڈیا ریڈیو ہی سے وابستہ رہے۔ آپ کی پہلی شادی 1941ء میں لدھیانہ میں عزیزہ بی بی سے ہوئی، عزیزہ بی بی سے ابن انشاء کا ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہوئی، بعد ازاں گھریلو ناچاکی کے سبب دونوں کی طبیعت میں فرق کے سبب عزیزہ بی بی اور ابن انشاء میں علیحدگی ہو گئی، مگر طلاق نہ ہوئی، لہذا عزیزہ بی بی نے باقی تمام عمر ان کی بیوی کی حیثیت ہی سے زندگی بسر کی لیکن ان سے الگ رہیں۔

جب پاکستان بنا تو ابن انشاء اپنے اہل خانہ کے ساتھ ہجرت کر کے پاکستان آ گئے اور لاہور میں رہائش اختیار کر لی، انڈیا میں ریڈیو سے منسلک رہے تھے، اس لیے بھاگ دوڑ کر کے 1949ء میں وہ ریڈیو پاکستان کراچی کے نیوز سیکشن سے بطور مترجم منسلک ہوئے۔ کام کے سلسلے میں کراچی جانا ہوا، اپنی اوصوری تعلیم مکمل کرنے کا خیال آیا تو انہوں نے اردو کالج کراچی میں 1951ء میں ایم اے اردو کی شام کی جماعتوں میں داخلہ لے لیا اور 1953ء میں ایم اے کا امتحان کیا پہلی پوزیشن حاصل کی۔ ایم اے کرنے کے بعد ڈاکٹریٹ کیلئے تحقیقی کام کرنے کا سوچا بھاگ دوڑ کر کے مارچ 1954ء میں بعنوان (اردو نظام کا تاریخی و تحقیقی جائزہ) (آغاز تا حال) کا مقالہ ملا مگر وہ اپنے اس مقالے کو مکمل نہ کر سکے کچھ عرصہ کراچی میں گزارنے کے بعد لاہور تشریف لے آئے۔ دور جدید کے مسائل سے بھی ابن انشاء آگاہ تھے، اس کے لیے کالم نگاری کا راستہ اختیار کیا۔ وہ مختلف اخباروں کے لیے بڑی پابندی سے کالم لکھا کرتے تھے اور اپنی بے باک رائے پیش کیا کرتے تھے۔ کالم نگاری آخری عمر تک جاری رہی۔

ابن انشاء نے 1960ء میں روزنامہ "امروز" کراچی میں درویش دمشق کے نام سے کالم لکھنا شروع کیا۔ 1965ء میں روزنامہ "منجنام" کراچی اور 1966ء میں روزنامہ جنگ سے وابستہ گی اختیار کی جو ان کی وفات تک جاری رہی۔ دو شعری مجموعے، چاند نگر اور اس بستی کے کوچے میں 1976ء شائع ہو چکے ہیں۔ 1960ء میں چینی نظموں کا منظوم اردو ترجمہ (چینی نظمیں) شائع ہوا۔

کیا جھگڑا سود خسارے کا



## اقبال اور فلسفہ خودی

مصنف: یوسف



چیز اسکی ”روح“ ہے۔

در حقیقت نسان ”خاکی وجود“ کے تقاضے پورے کرنے میں دن رات مصروف ہے۔ وہ اس عمل میں اتنا لگن ہو جاتا ہے کہ وہ اپنا ”اصل وجود“ اپنی ”روح“ کو بھول جاتا ہے۔ وہ کھانے، پینے، معاشی سرگرمی، خاندان کے ضروریات پورے کرنے اور دیگر انسانی معاملات میں بہت آگے نکل جاتا ہے۔ یوں آہستہ آہستہ وہ مادہ پرست، دنیا پرست اور آخر کار شیطان کا کارکن بن جاتا ہے۔ وہ روح کے تقاضے پورے کرنا بھول جاتا ہے۔ وہ دنیا کی بھول بھلیوں میں اپنے خالق، اپنے رب کو فراموش کر دیتا ہے۔ وہ دن رات مادی وجود کی پرستش کرنے لگتا ہے۔ یہ ”نفس لہارہ“ کی کیفیت ہے اور بہت بڑی تباہی ہے۔

انسانی روح کیا ہے؟

انسان کی اصل حقیقت اسکی پاکیزہ روح ہے۔ انسانی روح کی وجہ سے اسے مسجود ملائک کا درجہ ملا ہے۔ روح کا تعلق مذہب اور رحمانیت سے ہے۔ یہی روح اسے دیگر حیوانوں سے الگ کرتی ہے۔ جسم کے مرنے سے روح نہیں مرتی۔ وہ واپس اپنے خالق کی پاس چلی جاتی ہے۔ اور تب انسان دنیاوی زندگی کا جواب دہ ہوتا ہے۔ محض جسم کے تقاضے پورے کرنے سے ”روح“ کو چین نہیں مل سکتا۔

اقبال کا فلسفہ خودی ڈارون کی زہریلی تھیوری آف بیومن ایولوشن کا تریق ہے:

ڈارون نے کہا تھا کہ انسان حیوان کی ترقیاتی شکل ہے۔ حیوان اور انسان ایک ہی چیز ہے۔ بس انسان نے ذرا ترقی کی اور موجودہ تہذیب تک پہنچا۔ اسکے مطابق انسان محض حیوانی جبلتوں کا حامل ہے۔ مان، بہن، بیٹی اور بیوی میں کوئی فرق نہیں۔ حیوان کی طرح انسان جس سے چاہے اور جب چاہے، جنسی اختلاط کر سکتا ہے۔ حیوانوں کی طرح انسانوں کا بھی کوئی مذہب نہیں ہونا چاہئے۔ گویا ”جانور“ انسان کا باوہ آدم ہے۔ چنانچہ ”ڈارون“ کے اس تباہ کن نظریے نے مذہب، ادب، اخلاقیات، شرف انسانیت کا جنازہ نکال دیا ہے۔

اقبال کا ”فلسفہ خودی“ ڈارون کے اس تھیوری کا توڑ ہے۔ اور اسکے زہریلے اثرات کا تریق بھی ہے۔ اقبال کی خودی کا فلسفہ انسان کو جانور سے بلند تر مخلوق بتاتا ہے۔ یہ ہمیں حیوانی طرز حیات سے بلند کر کے رحمانیت کا راستہ دکھاتا۔ انسان کے خاکی وجود سے مایوس بھی اسکی ایک عظیم ہستی ہے، جسے فنا نہیں۔ انسان کی زندگی کا اصل مقصد اللہ کی خوشنودی ہے۔

تو راز کن دکھ ہے، اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا

خودی کا راز داں ہو جا، خدا کا ترہاں ہو جا

خودی کی معنی: خودی کے دو معنی ہیں۔ ایک یہ کہ خودی محمود ہے، مقبول ہے، قابل قبول ہے، قابل ستائش ہے، اچھی چیز ہے۔ یہ ہر باطل سے استغناء اور بے نیاز ہے۔ اس میں

انسان اپنے اندر کی روشنی کو پہچاننے کی کوشش کرتا ہے، وہ اپنی اصلیت کی تلاش کرتا ہے۔ وہ نفس مطمئنہ سے بھی آگے کے سفر پر ریاقت کرتا ہے اور وہ اپنے روحانی تقاضوں کو پورا کرتا ہے اور یوں اپنے مالک، اپنے رب تک پہنچ جاتا ہے۔ یہ خودی انسان کی انا ہے، عزت ہے، غیرت ہے، اسکی اندر کی ”میں“ ہے، اسکی روح ہے۔ اور یہی اسکی اصل پہچان ہے۔ خاکی وجود کے علاوہ جو اسکی روح ہے اسکی پہچان اور عرفان انسان کا اصل مقصد حیات ہے۔ اسی عرفان کی وجہ سے بندہ اپنے رب کی رضا کے لئے دن رات لگ جاتا ہے۔ حیوانی خواہشوں کی پوجا کی بجائے انسان اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق زندگی گزارتا ہے۔

اسکا ایک دوسرا مطلب بھی ہے: کہ انسان جب نفس لہارہ کا چٹا ری بن جاتا ہے تو ایسے بندے کی خودی اسے حیوان کے برابر کر دیتی ہے۔ اس حالت میں انسان اپنے نفس کا غلام بن جاتا ہے۔ وہ اپنے اندر کی روشنی کو بھول کر اپنی دنیا پرستی اور ہوس پرستی کی وجہ سے خاکی وجود کی پرستش کرتا ہے۔ تب یہ خودی بری چیز ہے، قابل مذمت ہے اور خودی کی یہ کیفیت بہت مذموم ہے۔

اقبال خودی کو ان دو نون مطالب میں استعمال کرتا ہے۔ وہ نفس لہارہ والی خودی کو ترک کرنے اور نفس مطمئنہ والی خودی کو اپنانے کی تلقین کرتا ہے۔ ”طلوع سر“ میں اقبال کہتا ہے:

خودی میں ڈوب جا غافل! یہ سر زندگانی ہے

نکل کر حلقہ شام و سحر سے جاوایں ہو جا

فلسفہ خودی کی اساس: علامہ اقبال کے فلسفہ خودی کا ماخذ قرآن حکیم کی ”سورۃ حشر آیت نمبر آٹھارہ“ ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد مرحوم متعدد مرتبہ اپنے لیکچرز میں اس حقیقت کی گواہی دے چکے ہیں۔ اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ جب انسان اپنے پیدا کرنے والے اور تخلیق کرنے والے رب کو بھلا دیتا ہے، تو اللہ تعالیٰ بھی ایسے انسان کو اپنا آپ بھلا دیتا ہے۔ اللہ نے انسان کو پیدا کیا تاکہ وہ اپنے من میں ڈوب کر اپنے رب کو تلاش کرے۔ وہ دیکھے کہ اسکی اصل حقیقت کیا ہے، ملائکہ سے اسکو سیدہ کروایا گیا ہے۔ وہ ایک بلند مخلوق ہے۔ وہ حیوان نہیں ہے بلکہ اللہ نے اسے اشرف المخلوقات بنا یا ہے۔ لہذا وہ اپنی پاکیزہ روح کو پہچانے۔ اپنے اندر جھانکے تو اسے معلوم ہوگا کہ اسکی زندگی کا کوئی عظیم مقصد ہے۔ اس مقصد کے حصول میں اپنی زندگی گزارے۔ لیکن اگر انسان ایسا کرنے کی بجائے اپنے خالق کو بھول بھال کر نفس لہارہ کا غلام بن جائے، شیطان کا چٹاری ری بن جائے اور دن رات اپنے خاکی وجود کی ضرورتیں پوری کرنے میں لگ جائے تو پھر اللہ تعالیٰ ایسے انسان کو اپنی رحمت اور ہدایت سے دور کر دیتا ہے، وہ مردود ہو جاتا ہے۔ جو انسان اپنے رب کا ناشکرہ بن جاتا ہے، اللہ سے بے خوف ہو جاتا ہے تو اسکا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ اپنی اصلیت اور حقیقت کو بھی بھول جاتا ہے۔ پھر وہ نفس آمارہ اور نفس آوارہ

میسویں صدی میں اسلامی فکر کے احیاء و تجدید میں شاعر مشرق علامہ اقبال کا نام ایک روشن ترین مینار کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ دنیا بھر کی ادبی تاریخ میں بہت کم ایسی شخصیات ملتی ہیں جنہوں نے علامہ اقبال کی طرح ذہنوں پر اتنے گہرے اثرات مرتب کئے ہوں اور سیاسی و سماجی دھارے کا رخ موڑ دیا ہو۔ انکا خطبہ الہ آباد ہندوستانی مسلمانوں کی بیداری کی اساس بنا۔ علامہ اقبال نے پاکستان کا خواب دیکھا اور صاف صاف بتا دیا کہ ”خودی کی تلوار“ سے مسلمانان ہند کا ایک الگ آزاد اسلامی ملک وجود میں آنے والا ہے۔ اقبال کا ہی احسان ہے اور کارنامہ بھی کہ قائد اعظم کو اس جدوجہد کا رہبر بننے پر راضی کیا۔ علامہ انیس سو اڑتیس میں فوت ہوئے لیکن اسکے افکار سے پاکستان، انڈیا، ایران، ترکی، افغانستان اور مشرق کے ساتھ ساتھ مغرب بھی استغناء دہ کر رہا ہے۔ اقبال نے بالکل ٹھیک کہا تھا: کہ

ع اک ولولہ تازہ دیا میں نے دلوں کو

لاہور سے تا بہ خاک بخارا و سر قند

علامہ اقبال کی شاعری کا بنیادی مرکز ”فلسفہ خودی“ ہے۔ انھوں نے خودی کے فلسفے کو اس قدر شاندار اور بے مثال انداز میں پیش کیا ہے کہ اس پر غور و فکر کرنے اور پھر عمل کرنے سے نہ صرف فرد بلکہ اقوام بھی اپنی زندگیوں میں انقلابی تبدیلی لا سکتے ہیں۔ اور وہ شیطان کی بیرونی کی بجائے ایک اللہ کی بندگی کی طرف لوٹ سکتے ہیں۔

اب ہم اس پر تفصیل کے ساتھ بات کرتے ہیں۔

انسان کا وجود: انسان کا وجود دو چیزوں کا مجموعہ ہے۔ ایک اسکا بدن ہے، اسکا ”خاکی وجود“ ہے اور دوسری

میں ڈوب جاتا ہے۔ یہ عظیم خسارہ ہے۔ یہ سب سے بڑی تباہی ہے۔ اقبال مسلمانوں کو کہتا ہے کہ:

ع بے خبر تو جو ہر آئینہ ایام ہے

تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے۔

وہ کہتا ہے کہ مسلمان اپنے آپکو، اپنے تن من کو نفسِ امارہ کی پیروی کرنے میں فقط چند دنیوی اشیاء کے حصول میں نہ کھپائے۔ اگر وہ اپنے رب کا ناشکرا ہے تو پھر اللہ تو بے نیاز ہے۔ پھر خسارے میں تو انسان ہی رہے گا۔

لہذا اقبال نے محسوس کیا کہ مسلمانوں کو اس خسارہ عظیم اور نفسانی آوارگی سے واپس روحانی زندگی میں لانے کا واحد نسخہ کیمیا ”فلسفہ خودی“ میں ہے۔ جب فلسفہ خودی سے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف مراجعت کا سفر اختیار کر لیں گے تو دین و دنیا دونوں میں فلاح پالیں گے۔ انکے خیال میں مسلمانوں کی پسماندگی، غلامی، جہالت اور دنیا پرستی کا علاج ”فلسفہ خودی“ میں پنہاں ہے۔

اقبال کہتا ہے:

ع دیر عشق میں اپنا مقام پیدا کر

نیا زمانہ نئی صبح و شام پیدا کر

میرا طریق امیری نہیں، فقیری ہے

خودی نہ بچ غریبی میں نام پیدا کر

خودی کے خواص:

اقبال کے شاہین کے جو صفات ہیں، وہی فلسفہ خودی کے خواص ہیں

بلند پرواز، تیز نگاہ، کسی اور کا مارا ہوا شکار نہ کھانا، خلوت پسندی۔ جب انسان نفسِ ترین خودی کی منزل کی طرف اپنا سفر شروع کرتا ہے تو وہ ان صفات کا حامل ہوتا ہے۔ وہ فقر و عشق سے بھی معمور ہوتا ہے۔ تب وہ اپنی منزل کے اختتام پر مرد مومن اور مرد حق بن جاتا ہے۔ تب وہ خودی کے دیگر مدارج بھی طے کر کے اللہ کا صحیح کارکن اور قبولِ بندہ بن جاتا ہے۔ خودی کے بیٹھے پھل کا درخت آتا ہے۔

عشق کے بغیر کوئی انسان نفسِ امارہ سے بلند ہو کر نفسِ راضیہ کے مدارج طے نہیں کر سکتا۔ سچی بات یہ ہے کہ انسان نفسِ امارہ کے دلدل سے خاک کی وجود کو نکال کر دھو دی محمود کی طرف کا روح پرور سفر، عشق کے بغیر نہیں کر سکتا۔

خودی کے مدارج:

نفسِ امارہ۔ نفسِ لوامہ۔ نفسِ ملحمہ۔ نفسِ مطمئنہ۔ نفسِ مرضیہ۔ نفسِ راضیہ۔

نفسِ امارہ: اسکا مطلب ہے، دنیا پرستی، مادہ پرستی اور شیطان پرستی۔ تکبر، غرور اور انکار حتیٰ کہ انسان کفر کے مقام پر پہنچ جاتا ہے۔

□

نفسِ لوامہ: انسان جب مادہ پرستی ترک کرتا ہے اور رب کی رضا کی طرف سفر شروع کرتا ہے۔ اپنے رب کی رضا کے لئے عبادات اور ریاضت شروع کرتا ہے۔ یہ کامیابی کا راستہ ہے۔ یہ وہ مقام ہے جب ایک مسلمان کو اپنی اصلیت کا احساس ہو جاتا ہے کہ اللہ نے اسے خاکی وجود کے ساتھ ساتھ اسکے اندر ایک نفسِ روح بھی عطاء فرمائی ہے۔ اس روح کی پہچان اور اسکے تقاضے پورے کرنا لازم ہے۔ رب نے اسے اپنی بندگی کے لئے پیدا کیا ہے۔ اور یہ کہ مادہ پرستی اور خدا کی مرضی کے خلاف دنیا پرستی خسارے کا سودا ہے۔

نفسِ ملحمہ: خودی اور خود آگاہی کے راستے پر سفر کرتے کرتے انسان اس مقام پر آجاتا ہے جب رب کی طرف سے نیک اور پاکیزہ خیالات آنے لگتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے رہنمائی ملتی ہے۔

نفسِ مطمئنہ: اس مقام پر انسان خدا کا مخاطب ہو جاتا ہے۔ وہ خدا کے قریب اور شیطان سے کافی دور چلا جاتا ہے۔ انسان کو اطمینانِ قلب نصیب ہو جاتا ہے۔ دنیوی آسائشیں اور دلکشاں بے معنی ہو جاتی ہیں۔ وہ ہر حال میں اپنے رب کی رضا پر خوش رہتا ہے۔ کوئی شکوہ شکایت نہیں رہتی۔

نفسِ راضیہ: بندگی اور خودی کا سفر جب مزید آگے بڑھتا ہے تو اللہ تعالیٰ انسان سے راضی ہو جاتا ہے۔ بندہ اپنی بندگی کے اس مقام پر اپنے رب کو راضی کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ایک مسلمان اپنی عبادات اور ریاضتوں سے اپنے محبوب رب کو خوش کر دیتا ہے۔ تب اللہ اپنے بندے فرماتا ہے کہ تو میرا سچا بندہ ہے۔ میں تیری بندگی سے راضی ہوں۔ اقبال کہتا ہے:

ع ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن

گفتار میں کردار میں اللہ کی بُہان

نہ تاج و تخت میں ہے نہ لشکر و سپاہ میں ہے

جو بات مردِ قلندر کی نگاہ میں ہے

نفسِ مرضیہ: خودی اور کامل بندگی کی بلندی کا یہ آخری مقام ہے خدا تعالیٰ سب سے بڑا قدردان ہے۔ یہ وہ مقام ہے جب اللہ پاک اپنے بندے سے اتنا خوش ہو جائے کہ اپنے بندے کی مرضی کے مطابق فیصلے کرنے لگے۔ جب انسان مقتدر بن جائے۔ اس مقام پر انسان اپنے تقدیر خود کھوانے لگتا ہے۔ اللہ اسکی ہر مراد پوری کرتا ہے۔ ہر سفارش قبول کرتا ہے۔ اللہ رعا لُ اپنی خلایق اسکے تابع کر دیتا ہے۔ خودی کے اس آخری درجے پر بندہ اپنے خالق کی اس قدر دانی کا حقدار بن جاتا ہے۔

علامہ اقبال نے اس مقام کی صحیح عکاسی کے لئے ہی وہ مشہور شعر کہا ہے:

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے

خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

اور

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اسکی زورِ ہاؤ کا

نگاہِ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

حضرت علامہ اقبال کا ”فلسفہ خودی“ انکی شاعری کا نچوڑ ہے۔ یہ وہی فلسفہ ہے جسے برصغیر کے کمزور اور غلام مسلمانوں نے اپنا کر اپنے لئے ایک الگ آزاد وطن پاکستان حاصل کیا۔ اس فلسفے پر عمل پیرا ہو کر ہم آج بھی اپنی دنیوی زندگی کا رخ موڑ سکتے ہیں تاکہ فانی انسان جو کہ اپنی اصلیت، اپنی روح کی تقاضوں کو بھول چکا ہے وہ ایک اللہ کی مرضی کے مطابق اپنی روح کی پرورش شروع کر سکے۔

قرآن مجید کی سورۃ حشر میں اللہ نے جس نوع کے انسانوں کو ناپسند فرمایا ہے، ہمیں چاہئے کہ ہم ایسے انسانوں کا راستہ چھوڑ دیں جنہوں نے رب کو بھلا دیا ہے۔ وہ خسارے اور مکمل تباہی کا راستہ ہے۔ اقبال ہمیں تعلیم دیتا ہے کہ فانی وجود کو اتنا وقت دو جتنا انسانی بدن نے اس دنیا میں رہنا ہے اور اپنی ”روح“ کی پاکیزگی کو اتنا وقت دیں جتنا اس نے وہاں اُس جہاں میں اپنے خالق کے پاس رہنا ہے۔

اقبال کا ”فلسفہ خودی“ اپنانے میں انسانیت کی فلاح ہے۔ اس میں شیطان کی غلامی سے نجات ہے۔ سچ یہ ہے کہ مادہ پرستی اور نفسِ امارہ کا راستہ چھوڑ کر اقبال کے فلسفہ خودی کو اپنا کر اور سورۃ حشر کے مطابق ہم اپنے رب کی رضا کا راستہ اختیار کر سکتے ہیں۔

’اسرارِ خودی‘ میں اقبال کہتا ہے:

اے مسلمان! تُو خودی کو نہ چھوڑ اور خود کو اس طرح بنالے، جسکا انجام بقاء پر ہو۔

تیری چمک دمک خودی کی نور سے ہے۔ اگر تُو اپنی خودی کو مضبوط کر لے، تُو تجھے دوام حاصل ہو جائے۔

ایک شخص نے بہتر گھر خریدنے کیلئے اپنا پہلے والا گھر بیچنا چاہا۔  
اس مقصد کیلئے وہ اپنے ایک ایسے دوست کے پاس گیا جو جائیداد کی خرید و فروخت میں اچھی شہرت رکھتا تھا۔  
اس شخص نے اپنے دوست کو مدعا سنانے کے بعد کہا کہ وہ اس کے لئے گھر برائے فروخت کا ایک اشتہار لکھ دے۔  
اس کا دوست اس گھر کو بہت ہی اچھی طرح سے جانتا تھا۔ اشتہار کی تحریر میں اس نے گھر کے محل وقوع، رقبے، ڈیزائن، تعمیراتی مواد، باغیچے، سوئنگ پول سمیت ہر خوبی کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا۔  
اعلان مکمل ہونے پر اس نے اپنے دوست کو یہ اشتہار پڑھ کر سنایا تاکہ تحریر پر اسکی رائے لے سکے۔  
... اشتہار کی تحریر سن کر اس شخص نے کہا، برائے مہربانی اس اشتہار کو ذرا دوبارہ پڑھنا اور اس کے دوست نے اشتہار دوبارہ پڑھ کر سنا دیا۔  
اشتہار کی تحریر کو دوبارہ سن کر یہ شخص تقریباً چیخ ہی پڑا کہ کیا میں ایسے شاندار گھر میں رہتا ہوں؟  
اور میں ساری زندگی ایک ایسے گھر کے خواب دیکھتا رہا جس میں کچھ ایسی ہی خوبیاں ہوں۔ مگر یہ کبھی خیال ہی نہیں آیا کہ میں تو وہی ایسے گھر میں رہا ہوں جس کی ایسی خوبیاں تم بیان کر رہے ہو۔ مہربانی کر  
کے اس اشتہار کو ضائع کر دو، میرا گھر بکاؤ ہی نہیں ہے۔  
ایک بہت پرانی کہاوت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ نعمتیں تمہیں دی ہیں ان کو ایک کانڈ پر لکھنا شروع کر دو، یقیناً اس لکھائی کے بعد تمہاری زندگی اور زیادہ خوش و خرم ہو جائے گی۔  
اصل میں ہم اللہ تعالیٰ کا شکر کرنا ہی بھلائے بیٹھے ہیں کیوں کہ جو کچھ برکتیں اور نعمتیں ہم پر برس رہی ہیں ہم ان کو گننا ہی نہیں چاہتے۔

ہم تو صرف اپنی گنی چنی چند پریشانیاں یا کمی اور کوتاہیاں دیکھتے ہیں اور برکتوں اور نعمتوں کو بھول جاتے ہیں۔  
کسی نے کہا: ہم شکوہ کرتے ہیں کہ اللہ نے پھولوں کے نیچے کانڈ لگا دیئے ہیں۔ ہونا یوں چلیے تھا کہ ہم اللہ کا شکر ادا کرتے کہ اس نے کانٹوں کے اوپر بھی پھول اگا دیئے ہیں۔  
ایک اور نے کہا: میں اپنے ننگے پیروں کو دیکھ کر کڑھتا رہا، پھر ایک ایسے شخص کو دیکھا جس کے پاؤں ہی نہیں تھے تو شکر کے ساتھ اللہ کے سامنے سجدے میں گر گیا۔

اب آپ سے سوال

کتنے ایسے لوگ ہیں جو آپ جیسا گھر، گاڑی، ٹیلیفون، تعلیمی سند، نوکری وغیرہ، وغیرہ، وغیرہ کی خواہش کرتے ہیں؟  
کتنے ایسے لوگ ہیں جب آپ اپنی گاڑی پر سوار جا رہے ہوتے ہو تو وہ سڑک پر ننگے پاؤں یا پیدل جا رہے ہوتے ہیں؟  
کتنے ایسے لوگ ہیں جن کے سر پر چھت نہیں ہوتی جب آپ اپنے گھر میں محفوظ آرام سے سو رہے ہوتے ہیں؟  
کتنے ایسے لوگ ہیں جو علم حاصل کرنا چاہتے تھے اور نا کر سکے اور تمہارے پاس تعلیم کی سند موجود ہے؟  
کتنے بے روزگار شخص ہیں جو فاقہ کشی کرتے ہیں اور آپ کے پاس ملازمت اور منصب موجود ہے؟  
اور وغیرہ وغیرہ ہزاروں باتیں لکھی اور کہی جاسکتی ہیں۔۔۔۔۔

کیا خیال ہے ابھی بھی اللہ کی نعمتوں کے اعتراف اور انکا شکر ادا کرنے کا وقت نہیں آیا کہ ہم کہہ دیں

یا رب لک الحمد کما ینبغی لجلال وجہک و عظیم سلطانتک

اللہم لک الحمد حتی ترضی و لک الحمد اذا رضیت و لک الحمد بعد الرضا

## چینی کے بغیر چینی چائے کا لطف

مصنف: یوسف

گی اور اگر فوری بعد پی تو بد ہضمی کا شکار ہو سکتے ہیں۔ ایک اور اہم بات جس کا چینی افراد بہت خیال رکھتے ہیں کہ چائے کے ساتھ کسی بھی قسم کی ادویات کا استعمال نہیں کریں گے ایسا نہیں کہ پاکستان میں ہم بخار یا سر درد کی گولی بھی اکثر چائے کے ساتھ ہی لیتے ہیں۔ قارئین کی دلچسپی کے لیے ایک اور بات کا تذکرہ بھی ضروری ہے کہ دفاتر، گھر اور ہوٹل میں پی جانے والی چائے میں بھی فرق ہو گا مثلاً دفاتر میں زیادہ گرین ٹی یا سبز چائے استعمال کی جائے گی اس کی وجہ بتائی جاتی ہے کہ سبز چائے میں ایسے اجزاء پائے جاتے ہیں جو کمپیوٹر سے نکلنے والی شعاعوں سے انسانی جسم کو بچانے میں مفید ثابت ہوتے ہیں اور انسانی جسم میں سبز چائے نمی کی مقدار کو برقرار رکھنے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔

اگر چین میں چائے کی مختلف اقسام کے حوالے سے دیکھیں تو ان کو گرین ٹی، بلیک ٹی، ڈارک ٹی، اولانگ ٹی اور وائٹ ٹی میں تقسیم کیا گیا ہے اور چائے کی ہر قسم کے ساتھ کچھ کہاو تیں یا کچھ روایات منسوب ہیں۔ مثلاً گرین ٹی کو سادگی سے منسوب کیا جاتا ہے اور عام طور پر جنوبی چین میں رہنے والے باشندوں کے حوالے سے کہا جاتا ہے وہ اس کو زیادہ استعمال کرتے ہیں، بلیک ٹی کو ایسے افراد سے منسوب کیا جاتا ہے جو نرم دل اور شرمیلے ہوتے ہیں، اولانگ ٹی کو ملنسار اور عام طور پر فلسفیانہ مزاج رکھنے والے افراد کی پسند قرار دیا جاتا ہے اسی طرح ڈارک ٹی کو بزرگ دانا افراد کی پسند میں شمار کیا جاتا ہے۔ ایک اور بات نہایت اہم ہے کہ پورے چین میں چینی کے بغیر چائے پینے کا رواج ہے کیونکہ چین کے لوگ چینی کے زیادہ استعمال کو صحت کے لیے انتہائی نقصان دہ قرار دیتے ہیں اور موٹاپے کی بڑی وجہ بھی چینی کے زیادہ استعمال کو قرار دیتے ہیں۔

اگر معاشی اعتبار سے دیکھیں تو چین میں چائے کی صنعت ملک کی معاشی ترقی میں بھی ایک کلیدی کردار ادا کر رہی ہے اور چین کا شمار دنیا کے ان بڑے ممالک میں ہوتا ہے جو دنیا کے دیگر ممالک کو چائے کی برآمد میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ چین کی حکومت بھی اس صنعت کی ترقی کے حوالے سے اقدامات کرتی رہتی ہے اور یہ کوشش کی جاتی ہے جہاں ملکی ضروریات کو پورا کیا جا سکے وہاں بیرونی ممالک میں بھی معیاری چائے برآمد کی جا سکے۔ اسی اہمیت کے پیش نظر ملک کے مختلف حصوں میں چائے کی صنعت کی ترقی اور ملک میں ٹی کلچر کے فروغ کے لیے بھی مختلف سیمینارز، کانفرنسز اور دیگر تقاریب کا انعقاد کیا جاتا ہے۔ سو جب بھی چین آئیں چینی چائے سے ضرور لطف اٹھائیں لیکن وہ بھی بغیر چینی کے۔

§§§

چینی ثقافت میں چائے کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے اگرچہ پاکستان میں پی جانے والی چائے سے چینی چائے قدرے مختلف ہے لیکن چائے سے منسلک کچھ روایات، چائے سے جڑے کچھ لوازمات اور لوگوں کی پسندیدگی کے مختلف معیارات چینی چائے کو ایک خاص رنگ دیتے ہیں۔ چینی معاشرے میں اگر چائے کی تاریخ کا جائزہ لیں تو ہمیں پانچ ہزار سال پیچھے جانا پڑے گا۔ بتایا جاتا ہے کہ ایک چینی بادشاہ شین ٹونگ نے اپنے دور حکومت میں جہاں دیگر فرمان جاری کیے ان میں ایک حکم یہ بھی تھا کہ صحت مند اور توانا رہنے کے لیے پینے کے پانی کو استعمال سے قبل ضرور ابالا جائے۔ گرمیوں کی ایک دوپہر اپنی سلطنت کے ایک دور دراز علاقے کے دورے کے دوران بادشاہ اور ان کے درباری ایک مقام پر سستانے کی غرض سے رکے اور بادشاہ سلامت کے لیے پانی ابالا جا رہا تھا کہ اسی دوران نزدیکی جھاڑی سے کچھ پتیاں اٹلتے پانی میں آگری اور پانی کا رنگ فوری تبدیل ہو گیا۔ اب بادشاہ کے دل میں پانی کے اس نئے ڈانکے کو چکھنے کی خواہش نے جنم لیا، جب انہوں نے پتیاں ملا رنگ دار پانی پیا تو ڈانکے دار بھی لگا سو یہیں سے چائے کا آغاز ہوتا ہے اور یہ دور تھا 2337 قبل مسیح۔ اس وقت سے لیکر آج تک چین میں چائے کو مختلف تقاریب میں نمایاں اہمیت حاصل ہے بلکہ یوں کہا جائے کہ چائے کا راج ہے تو بے جا نہ ہو گا۔

اگر چینی معاشرے میں چائے کے استعمال کی بات کی جائے تو اس میں بھی آپ کو مختلف رنگ ملیں گے۔ کچھ لوگ چائے کو پیاس بھانے اور پانی کے نعم البدل کے طور پر استعمال کرتے ہیں تو کچھ کے نزدیک چائے پینے سے ان کی تخلیقی صلاحیتیں کھل کر سامنے آتی ہیں۔ بعض افراد تو فطری ماحول سے محبت، موسیقی میں دلچسپی اور باہمی روابط استوار کرنے میں بھی چائے کے معترف نظر آتے ہیں۔ مزید دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ چین میں معیاری چائے کے بھی پیلانے وضع کیے گئے ہیں ایسا ہر گز نہیں کہ جس طرح پاکستان میں اکثر کہا جاتا ہے کہ بس چائے ہوئی چاہیے چاہے کسی ٹرک ہوٹل کی ہو یا کسی فابریو اسٹار ہوٹل، یہ الگ بات ہے کہ پاکستان میں لوگوں کی اکثریت ٹرک ہوٹل کی چائے کو کسی بھی بڑے ہوٹل کی چائے سے بہتر قرار دیتی ہے، پیلانوں کی بات ہو رہی تھی تو چین میں چائے کو جن خصوصیات کی بناء پر پرکھا جاتا ہے اس میں پہلی خاصیت چائے کی رنگت، دوسری چائے کی خوشبو، تیسری خاصیت چائے کا زائقہ ہے لیکن جناب بات یہیں ختم نہیں ہوتی مزید دو چیزیں اور بھی شامل ہیں جو پاکستان سمیت دیگر دنیا سے قدرے مختلف ہیں پہلی چیز پانی کا معیار مطلب یہ کہ پانی کون سا استعمال کیا گیا ہے اور آخری چیز چائے سیٹ، مطلب چائے پیش کرنے کے لیے کس قسم کے برتن استعمال کیے گئے ہیں۔ مختصر آئیگی کہ برتن چتنا معیاری اور اچھا ہو گا اتنی ہی چائے کے لیے پسندیدگی بڑھے گی، ویسے معیاری کو آپ مٹکے برتن سے بھی تعبیر کریں تو کوئی حرج نہیں۔

اب چائے تو پیش کر دی گئی اگلا مرحلہ پینے کا ہے تو جناب چین میں چائے پینے کے بھی کچھ اصول ہیں مثلاً چائے آپ نے گرم گرم ہی ختم کرنی ہے ایسا نہیں کہ ساتھ ساتھ دفتر کا کام بھی جاری ہے اور چائے بے شک ٹھنڈی ہو جائے، اس حوالے سے کہا جاتا ہے کہ چائے میں موجود مفید اجزاء سے لطف اندوز صرف گرم چائے سے ہی ہوا جا سکتا ہے۔ ایک اصول یہ بھی ہے کہ زیادہ سخت یا اگر پاکستانی لفظ استعمال کریں تو زیادہ کڑک چائے نہیں پینی ہے بقول چینی افراد کے کہ زیادہ کڑک چائے انسانی معدے کے لیے نقصان دہ ہے۔ اس کا معیار یہ طے کیا گیا ہے کہ پورے دن میں آپ بارہ سے پندرہ گرام کے درمیان چائے کی پتیاں استعمال کریں گے۔ چائے پینے کے لیے بہترین اوقات کا تعین بھی کیا گیا ہے ایسا نہیں ہے کہ جب جی چاہا چائے پی لی، چینی افراد کھانے سے کچھ دیر قبل یا فوری بعد چائے نہیں پیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر کھانے سے پہلے چائے پی لی تو جھوک ختم ہو جائے

شپ اہم ہیں۔ شہر کے قابل دید مقامات میں ایئر پورٹ، عجائب گھر، پنجاب یونیورسٹی، باغ جناح، شالامار باغ، مینار پاکستان، مال روڈ، انارکلی گلشن اقبال اور ریس کورس پارک شامل ہیں۔

مینار پاکستان کا ڈیزائن ترک ماہر تعمیرات نصر الدین مرآت خان نے تیار کیا۔ تعمیر کا کام میاں عبد القادر ایڈر کمپنی نے 23 مارچ 1960 میں شروع کیا۔ 21 اکتوبر 1968 میں اس کی تعمیر مکمل ہوئی۔ اس پر کل لاگت 75 لاکھ روپے آئے۔



بادشاہی مسجد لاہور میں شاہی قلعے کے نزدیک واقع ہے۔ اس مسجد کو مغل بادشاہ شا جہاں نے بنوایا تھا۔ اس میں دو لاکھ کے قریب نمازی نماز ادا کرتے ہیں۔ اس کے چاروں کونوں میں بہت اونچے مینار ہیں۔ مینار پر چڑھنے کے لیے باقاعدہ لکٹ لینا پڑتا ہے۔ اس مسجد کے درمیان میں بڑا حوض ہے۔

مسجد میں تین بڑے سنگ مرمر کے گنبد ہیں۔ ان پر مینا کاری اور گل کاری کی ہوئی ہے۔ جسے دیکھ کر مغلیہ راج کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ مسجد میں داخل ہونے کے لیے پچاس سیڑھیاں چڑھنی پڑتی ہیں۔ یہاں لوگوں کی بڑی تعداد جمعہ اور عیدین ادا کرتے ہیں جبکہ پانچوں نمازوں میں بھی بہت رش دیکھنے میں آتا ہے۔



## لاہور ایک قدیم شہر

مصنف: یوسف

تحریک پاکستان کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے۔ جتنی خود مسلمانوں کی۔ اس لیے کہ پاکستان دو قومی نظریے کی بنیاد پر حاصل کیا گیا۔ دو قومی نظریے کی بنیاد ہندوستان میں اس دن پڑ گئی تھی۔ جس دن ساحل مالا بار کی ریاست گدنگا نور کے حکمران راجہ سامری نے اسلام قبول کیا تھا۔ رفتہ رفتہ دین اسلام کی شواہیں پھیلتی گئیں۔ محمد بن قاسم نے 712 میں سندھ فتح کر کے اسلامی حکومت کی بنیاد رکھی۔ اسلامی حکومت کے قیام سے انگریز حکومت تک مختلف مسلمان خاندانوں کی حکمرانی میں برصغیر میں اسلامی حکومت قائم رہی۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد اس کے نااہل جانشینوں کے باعث برطانوی حکومت نے اسلامی حکومت پر قبضہ کر لیا۔ ہندوؤں نے گٹھ جوڑ کرتے ہوئے اسلامی دشمنی کے سبب وسیع پیمانے پر مسلمانوں کا جانی و مالی نقصان کرانے کی بھرپور کوشش کی۔

1938 میں سندھ مسلم لیگ کی اکثریت کے ساتھ آزاد ملک کے حق میں باقاعدہ ایک قرارداد منظور کی اور 23 مارچ 1940 کو مسلم لیگ کے 27 ویں سالانہ اجلاس منعقدہ لاہور میں ایک اسلامی مملکت کے قیام کا مطالبہ کر دیا۔



لاہور صوبہ پنجاب پاکستان کا دار الحکومت اور پاکستان کا دوسرا بڑا شہر ہے۔ یہ پاکستان کا ثقافتی، تعلیمی اور تاریخی مرکز ہے۔ اسے پاکستان کا دل بھی کہا جاتا ہے۔ یہ شہر دریائے راوی کے کنارے واقع ہے۔ اس کی آبادی ایک کروڑ کے قریب ہے۔ شاہی قلعہ، شالامار باغ، بادشاہی مسجد، مقبرہ جہانگیر اور مقبرہ نور جہاں مغل دور کی یادگار ہیں۔ لاہور کو پہلے عروس اہلند لاہور بھی کہتے تھے اور یہ علاقہ ملتان کی عظیم سلطنت کا حصہ ہوتا تھا۔

لاہور کی مغلیہ دور میں بھی اپنی ایک حیثیت رہی ہے۔ بابر پہلے سے ہی ہندوستان پر حملہ کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ دولت خان لودھی کی دعوت نے اس پر مہمیز کا کام کیا۔ لاہور کے قریب بابر اور ابراہیم لودھی کی افواج کا پہلا ٹکراؤ ہوا۔ جس میں بابر فتح یاب ہوا۔ لیکن جب اسے دولت خان کی سازش کی اطلاع ملی۔ جس پر وہ اپنا ارادہ ختم کر کے لاہور کی جانب بڑھا۔

اس شہر میں کئی بزرگوں اور صوفیائے کرام کے مزارات ہیں جن میں حضرت داتا گنج بخش، حضرت میاں میر، مہدی اللہ حسین، حضرت شاہ ابوالعانی، حضرت موح دریا بخاری، حضرت گھوڑے شاہ، حضرت شاہ جمال، حضرت شاہ محمد غوث اور حضرت میاں وڈھا شامل ہیں۔ لاہور کا موجودہ شہر کئی جدید بستیوں اور عمارات سے آراستہ ہے۔ ان میں ماڈل ٹاؤن، گلبرگ، ڈیفنس، سبزہ زار گرین ٹاؤن اور ٹاؤن



نہیں آیا تو میں نے پوچھا آج ایسا کون سا خاص دن ہے؟ پاپا! آج مرد ڈے ہے، چھوٹے نے آواز لگائی۔ تب مجھے معلوم ہوا۔ پھر اس پر بحث ہونے لگی کہ کون سا بچہ اچھا ہے، کیا نتیجہ نکلا مجھے نہیں معلوم۔ میں کچھ دیر تک تو سوچتا رہا اور پھر خود بخود میرے پاؤں ان کے گھر کی سمت چل پڑے۔ وہ مجھے باہر ہی مل گئیں۔ کسی ہیں آپ ماں جی..... بہت شرمیلی ہیں وہ، مسکرائیں اور کہنے لگیں تم کیسے ہو؟ آج صبح سویرے ہی..... جی ماں جی آپ کو سلام کرنے آگیا۔

اور ہاں ایک اور بات..... میں آپ کو "وش" کرنے آیا ہوں۔ کس بات کی "وش"؟ انہوں نے پوچھا۔ ماں جی! آج مرد ڈے ہے ناں۔ جیتے رہو میرے بچے، سدا خوش رہو، خوشیاں دیکھو۔ ان کی آواز کا زبردوم میں کیسے تحریر کروں اور ان کے آنسو کیسے صفحہ پر بکھیروں۔ تھوڑی دیر آسمان کی طرف نکلی ہانڈھ کر دیکھتی رہیں، بالکل گرم سم۔ آپ ٹھیک تو ہیں ماں جی! میری آواز سن کر چونک سی گئیں اور وہاں اسی دنیا میں لوٹ آئیں۔ اب تو تمہارے سر کے بالوں اور داڑھی میں کافی سپیدی آگئی ہے، کیا تمہارے پوتے پوتیاں تم سے کہانی سننے کی فرمائش کرتے ہیں؟ جی ہاں، کبھی کبھار، وگرنہ آج کل تو اسکول کا ہوم ورک اور بعد میں کمپیوٹر پر بچوں کی مصروفیت کے بعد دوستوں سے موبائل فون کی گپ شپ اور ٹیکسٹ پیغامات نے تو گھر میں عجیب اجنبیت پیدا کر رکھی ہے، بچوں کے پاس اب بڑوں کے پاس بیٹھنے کی فرصت کہاں؟

تم نے مجھے "مرد ڈے" پر "وش" کر کے ماں جی تومان لیا اور اس میں کوئی ٹیک بھی نہیں کہ میں تم سے عمر میں کافی بڑی ہوں۔ چلو آج ہم دونوں ایک بھولی بھری روائت کو قائم کرتے ہیں۔ کہانی سنو گے؟ انہوں نے اچانک مجھ سے یہ فرمائش کر دی۔ "ضرور، کیوں نہیں، مدت ہوئی مجھے کوئی کہانی سننے ہوئے"۔ انہوں نے ایک کہانی سنائی۔ آپ بھی سنیں:

ایک شخص اپنی ماں کو پھول بھجوانے کا آرڈر دینے کے لیے ایک گل فروش کے پاس پہنچا۔ اس کی ماں دو سو میل کے فاصلے پر رہتی تھی۔ جب وہ اپنی کار سے نیچے اترا تو اس نے دیکھا کہ دکان کے باہر فٹ پاتھ پر ایک نو عمر لڑکی بیٹھی سسکیاں بھر رہی تھی۔ وہ شخص اس لڑکی کے پاس آیا اور اس کے رونے کا سبب پوچھا۔ لڑکی بولی: میں اپنی ماں کے لیے سرخ گلاب خریدنا چاہتی ہوں لیکن میرے پاس صرف پچاس پنس ہیں جبکہ گلاب کی قیمت دو پانڈ ہے۔ یہ سن کر وہ شخص مسکرایا اور اسے دلاسا دیتے ہوئے بولا، میرے ساتھ اندر چلو میں تمہیں گلاب دلادیتا ہوں۔ اس نے بچی کو گلاب خرید کر دے دیا اور اپنی ماں کے لیے پھولوں کا آرڈر بک کروایا۔ دکان سے باہر آنے کے بعد اس نے لڑکی کو گھر تک پہنچانے کی پیشکش کی۔ یس پلیز! لڑکی نے جواب دیا آپ مجھے میری والدہ کے پاس لے چلیں۔ لڑکی کی رہنمائی میں وہ ایک قبرستان تک پہنچے۔ لڑکی نے وہ سرخ گلاب ایک تازہ بنی ہوئی قبر پر رکھ کر دعا مانگنے لگی۔ وہ شخص پلٹ کر گل فروش کے پاس پہنچا اس نے اپنا آرڈر منسوخ کروایا اور ایک گل دستہ لے کر فوری اپنی ماں سے ملنے کے لیے روانہ ہو گیا۔

آخری فقرہ کہتے ہوئے ان کی آواز پکپکانے لگی تو میں نے اپنی جھلی گردن اٹھا کر ان کے چہرے پر نظر ڈالی تو انہوں نے منہ پھیر لیا کہ میں ان کی آنکھوں کی چغلی نہ پکڑ لوں۔ سنا ہے تم اخبارات میں لکھتے ہو؟ گلتا ہے جو بچے اپنی ماؤں سے ہزاروں میل دور رہتے ہیں، اب کیا وہ اپنی ماں کی قبر پر سرخ گلاب رکھ کر ہی محبت کا اظہار کریں گے؟ کتنا مشکل ہے اس طرح جینا.....! "اس سوال کا ہے کوئی جواب آپ کے پاس؟

اگر نہیں تو پھر جلدی کیجئے کہ ہمارے لئے توہرن "مرد ڈے" ہے۔

خبر کھیت میں جیون کی اک دکھیری بوڑھی ماں

بویا نہیں، جو کاٹ رہی ہے

کہیں سے بھی تھکی ہوئی نظر نہیں آتیں وہ۔ ہر دم ہر کام کے لیے کمر بستہ، ہر لمحہ مسکراتی ہوئی، اکثر دکان پر نظر آتی ہیں۔ ایک کاپی ان کے ساتھ سفر میں رہتی ہے جس پر دکاندار سودا سلف دے کر لکھ دیتا ہے اور پھر ہر ماہ پیسے وصول کر لیتا ہے۔ کپڑے مناسب ہی ہوتے ہیں۔ کبھی دبی لینے جا رہی ہیں، صبح سویرے چھوٹے بچوں کو اسکول چھوڑنے جا رہی ہیں، دوپہر میں ان کا بستہ اٹھائے آ رہی ہیں۔ شام کو بچے جب گلی میں کھیلنے ہیں تو وہ ان کی نگرانی کرتی ہیں۔ لڑائی ہو جائے تو بچوں میں صلح کراتی ہیں اور تھانے کیا کیا۔ کبھی ایک بھو کے ساتھ جا رہی ہیں کبھی دوسری کی دولا رہی ہیں۔ ہر دم تازہ دم۔ میں انہیں اکثر ہی دیکھتا ہوں اور چھٹی والے دن تو خاص طور پر۔ اتوار کو صبح سویرے ہر طرف سناہوتا ہے بندہ نہ بندے کی ذات لیکن وہ اللہ کی بندی اس دن کیاریوں سے گھاس چھونس الگ کرتی ہیں، خشک پتے سیمیٹتی ہیں، پھر پاپ لگا کر چڑھا کر کرتی ہیں۔



اس اتوار کو بھی یہی ہوا۔ میں چھت پر کھڑا نہیں دیکھ رہا تھا اور وہ اپنے کام میں منہمک تھیں۔ مجھے تو نہیں لگتا کہ وہ کبھی آرام کرتی ہوں گی۔ کبھی کبھی وہ اکیلی بیٹھی آسمان کو تکتی ہیں۔ بس ایک دفعہ میں نے انہیں اپنی آنکھیں صاف کرتے دیکھا ہے اپنی سفید چادر سے۔ شوہر کا انتقال تو بہت پہلے ہو گیا تھا، پانچ بیٹوں کی ماں ہیں وہ، اور وہ سب کے سب باہر مقیم ہیں۔ شاید وہ بھونیں ان کے ساتھ رہتی ہیں۔ ان کا کوئی بیٹا پاکستان آ رہا ہو تب ان کی خوشی دیدنی ہوتی ہے۔ پورے محلے کو بتاتی پھرتی ہیں: وہ کینیڈا والا آ رہا ہے۔ اور پھر وہ دن بھی آجاتا ہے جب ان کا لخت جگر پہنچتا ہے کچھ دن تک رہتا ہے تو وہ بہت خوش ہوتی ہیں۔ ہاں ایک دن اداس تھیں کہ وہ تو آتے ہی اپنے بچوں کو گھمانے پھرانے لگتا ہے، میرا بچہ تو پھر بھی مجھے نہیں ملتا، پھر وہ واپس چلا جاتا ہے اور ماں کی اداسی اور بھی گہری ہو جاتی ہے۔ جن بیٹوں کے بیوی بچے باہر ہیں، وہ تو کئی کئی سال کے بعد آگرتے ہیں تو ان کے پاس ایک چھوٹی سی ڈائری ضرور ہوتی ہے جس میں پہلے سے لکھا ہوتا ہے کہ پاکستان کے فلاں وقت اسے ہر حال میں اپنی بیوی بچوں کو فون ضرور کرنا ہے، بیوی بچوں کی فرمائشوں کی ایک لمبی فہرست الگ ہوتی ہے جن کی خریداری میں سارا دن بھٹکتے کے بعد جب واپس گھر لوٹتا ہے تو ہر سوس کی منتظر ماں کے سامنے اپنی تھکاوٹ کا اظہار کر کے لیٹنے کی کوئی جگہ ڈھونڈ کر بے خبر سو جاتا ہے اور ماں بار بار سوئے بیٹے کو دیکھ کر خوش ہوتی رہتی ہے..... یہ ہے ان کی زندگی۔

سانہے کہ وہ ایک کالج کی پرنسپل رہ چکی ہیں، ساری عمر درس و تدریس میں گزار دی۔ اب بھی کئی غریب بچیوں کی کفالت انتہائی پردہ داری اور خاموشی کے ساتھ سرانجام دیتی ہیں۔ مجھے اس بات کا کبھی پتہ نہ چلتا اگر بوڑھا ڈاکا مجھے اس کی اطلاع نہ دیتا۔ ایک دفعہ میں ان کے گھر کے سامنے سے گزر رہا تھا تو مجھے روک کر میرے کل شام کے ٹی وی پروگرام پر تبصرہ فرمانے لگیں۔ مجھے جہاں ان کی علمی گفتگو نے حیران کر دیا وہاں ان کی لاجواب یادداشت نے میرے دل و دماغ کے کئی چراغ روشن کر دیئے۔ میں جتنی دیر پاکستان میں رہتا ہوں ان سے جی بھر کر باتیں کرتا ہوں، ان کی ذخیر ساری باتیں سنتا ہوں بواہ سارا سال میرے لئے جمع کر کے رکھی ہوتی ہیں۔ میں جب ٹیلیفون پر ان کو سلام کرتا ہوں تو ان کی خوش کامی سے میرا دل معطر ہو کے رہ جاتا ہے لیکن مختصر سی بات کر کے یہ کہہ کر ختم کر دیتی ہیں کہ تمہیں خواہ مخواہ اس کا زیادہ بل آئے گا۔ آؤ گے تو خوب باتیں کریں گے۔

پانچ سال پہلے انہی دنوں میں پاکستان میں تھا۔ آہستہ آہستہ سورج چڑھنے لگا، بجلی نہیں تھی تو گرمی بڑھنے لگی اور پھر سارا محلہ وقت سے پہلے ہی جاگ اٹھا۔ مٹھے بیٹے نے اٹھتے ہی آواز لگائی: "مما آئی لو یو۔" تب سب سے چھوٹے کی آواز آئی، بھائی میں آپ سے جیت گیا۔ میں نے ماما کو سب سے پہلے "وش" کیا۔ تم تو اپنے نمبر بڑھاتے رہتے ہو اور پھر دونوں میں تھوڑی دیر تکرار۔ مجھے سمجھ میں